اسلام

اور

آج کا انسان

علامہ طباطبائی

مترجم: سید قلبی حسین رضوی

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

عرض ناشر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت وظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ وکلیاں رنگ ونکھار پیدا کر لیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ وراہ اجالوں سے پرنور ہو جاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت و قابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ اور موسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم وآگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمہ حق وحقیقت سے سیراب کر دیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھی، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصہ میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمران ایران وروم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑ گئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت و عمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذاہب عقل وآگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان ومذاہب اور تہذیب وروایات پر غلبہ حاصل کر لیا۔

اگرچہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروؤں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت وپاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہو کر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کر دی گئی تھی، پھر بھی حکومت وسیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمہ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء ودانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکار ونظریات سے متاثر اسلام وقرآن مخالف فکری ونظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگیں تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشت پناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانہ میں ہر قسم کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام وقرآن اور

مکتب اہل بیت علیہم السلام کی طرف اٹھیں اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکر اور معنوی قوت واقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام سے اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامران زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں، یہ زمانہ عملی اور فکری مقابلہ کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام (عالمی اہل بیت کونسل) نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیت عصمت و طہارت کے پیروؤں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجودہ دنیائے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف و شفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و معنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہو سکے، ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیت عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوتؐ و رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدو خال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق و انسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خون خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن و نجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین اور مترجمین کا ادنیٰ خدمت گار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج و اشاعت کے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، فاضل علامہ سید محمد حسین طباطبائی کی گرانقدر کتاب ''اسلام اور آج کا انسان'' کو فاضل جلیل مولانا سید قلبی حسین رضوی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

فہرست

عنوان--صفحہ نمبر

عنوان۔۔۔صفحہ نمبر

عنوان ---------------------------------- صفحہ نمبر

عنوان۔۔صفحہ نمبر

عنوان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صفحہ نمبر

پہلا حصہ

فطرت کی راہ

سوال: کیاموجودہ دنیاکے حالات اورروزمرہ حیرت انگیز ترقی کے پیش نظر باور کیاجاسکتاہے کہ اسلام عالم بشریت کانظم ونسق چلاکر موجودہ ضرورتوں کو پورا کر سکے گا؟ کیاحقیقت میں وہ وقت نہیں پہنچاہے کہ جب انسان علم کی قدرت سے آسمانوں پر کمند ڈال رہاہےاور ستاروں کو تسخیر کرنے جارہاہے، اب اسے ان کہنہ مذہبی افکار کو بالائے طاق رکھ کراپنی قابل فخر زندگی کے لئے ایک نئے اور تازہ طریقہ کار کاانتخاب کر کے اپنی فکروارادہ کی طاقت کواپنی

شاندار کامیابیوں پر متمرکز کرنا چاہئے؟

جواب: اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ایک نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے اور وہ یہ ہے: صحیح ہے کہ ہم فطری طور پر ہر نئی چیز کو پرانی چیز کی نسبت پسند کرتے ہیں اور ہر چیز کے نئے پن کو اس کے پرانے پن پر ترجیح دیتے ہیں لیکن بہر حال یہ کوئی کلی قاعدہ نہیں ہے اور اس طریقہ کار کو ہر جگہ پر لاگو نہیں کیا جاسکتاہ۔ مثال کے طور پر دو اور دو چار جو لاکھوں اور ہزاروں سال سے انسان میں رائج ہے اور اس سے استفادہ کیا جاتا ہے، اسے کہنہ سمجھ کر دور نہیں پھینکا جاسکتا ہے!

یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ عالم بشریت میں رائج اجتماعی اور معاشرتی زندگی اب کہنہ ہو چکی ہے، اس سلسلہ میں ایک نیا منصوبہ مرتب کرکے انفرادی زندگی کا آغاز کیا جانا چاہئے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ملکی قوانین جو کافی حد تک انسان کی انفرادی آزادی پر پابندیاں عائد کرتے ہیں، اب کہنہ ہو چکے ہیں اور لوگ ان سے تنگ آچکے ہیں، اس وقت جب کہ انسان فضا کو تسخیر کرنے میں لگا ہے اور ستاروں کی معلومات حاصل کرنے کے لئے ان کے مدار میں سٹلائٹ بھیج رہا ہے اس لئے ایک نئی راہ کا انتخاب کرنا چاہے اور قانون، قانون ساز اور قانون لاگو کرنے والوں کے چنگل سے آزاد ہونا چاہے۔

واضح اور روشن ہے کہ یہ باتیں کس حد تک بے بنیاد اور مذاق پر مبنی ہیں۔ اصولاً کہنہ اور نئے پن کا مسئلہ ایسے مواقع پر بیان کیا جاسکتا ہے کہ جو تغیر و تبدّل کے دائرہ میں آتے ہوں، جس کے نتیجہ میں کبھی بہتر اور شاداب اور کبھی نامناسب عوامل کی وجہ سے فرسودہ اور افسردہ ہو جاتے ہیں۔

اس لئے، حققت شناسی سے مربوط بحثوں کے سلسلہ میں، جو فطری تقاضوں سے متعلق ہیں اور خلقت و کائنات کے حقیقی قوانین کی تحقیق کرتے ہیں (جن میں سے ایک یہی ہمارا زیر بحث مسئلہ ہے: کیا اسلام موجودہ حالات کے پیش نظر عالم بشریت کا نظم و نسق چلا جاسکتا ہے؟) اس کے بارے میں کہنہ اور نئے پن کا مسئلہ نہیں چھیڑنا چاہے۔ ہر بات کی ایک خاص جگہ اور ہر نکتہ کا ایک مخصوص مکان ہوتا ہے۔

لیکن یہ کہ "کیا اسلام موجودہ حالات میں عالم بشریت کا نظم و نسق چلا سکتا ہے؟" یہ سوال بھی اپنی جگہ پر عجیب و غریب ہے اور اسلام کے حقیقی معنی کے مطابق بھی جو قرآن مجید کی دعوت پر مبنی ہے یہ سوال انتہائی تعجب آور ہے۔ کیونکہ "اسلام" وہ راستہ ہے جس کی انسان اور کائنات کی خلقت کی مشینری نشاندہی کرتی ہے۔ "اسلام" یعنی وہ قواعد و ضوابط جو بشریت کی خاص فطرت کے مطابق ہیں اور انسان کی فطرت کے ساتھ رکھنے والی مکمل ہم آہنگی کے پیش نظر انسان کی حقیقی ضرورتوں کو۔۔نہ فرضی اور جذباتی ضرورتوں کو۔۔پورا کرتے ہیں۔

بدیہی بات ہے کہ انسان کے انسان ہونے تک اس کی انسانی فطرت نہیں بدلتی اور انسان جس زمان و مکان میں ہو اور جس حالت میں بھی زندگی بسر کرتا ہو وہ اپنی انسانی فطرت پر گامزن ہوگا اور فطرت نے اس کے سامنے ایک راستہ معین کیا ہے، خواہ وہ اس پر چلے یا نہ چلے۔

اس بناء پر حقیقت میں مذکورہ سوال کا معنی یہ ہے کہ اگر انسان فطرت کی معینؐ کردہ راہ پر چلے تو کیا وہ اپنی فطری خوشحالی کو پاسکتا ہے اور اپنی فطری آرزوؤں تک پہنچ سکتا ہے؟ یا مثال کے طور پر اگر کوئی درخت اپنی فطری راہ۔۔جو مناسب وسائل سے مجہز ہے۔۔پر چلے تو کیا وہ اپنی فطری منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے؟ واضح ہے کہ بدیہیات کے بارے میں اس قسم کے سوالات مسلملات میں شک و شبہ ایجاد کرنے کے مترادف ہیں۔

اسلام، یعنی فطرت کی راہ، ہمیشہ انسان کی حقیقی راہ ہے جو اس کی زندگی کے مختلف حالات کے پیش نظر نہیں بدلتی ہے۔ اسکے فطری مطالبات۔۔نہ جذباتی اور توہماتی خواہشات۔۔اس کے حقیقی مطالبات اور فطری منزل مقصود اور سعادت و خوشبختی تک پہنچنے کے مطالبات ہیں۔ خدائے تعالی اپنے کلام میں فرماتا ہے:

)فأقم وجهک للدّین حنیفاً فطرت اللہ التی فطر النّاس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذٰلک الدّین القیّم ...)(روم،۳۰(

''آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے۔یقیناً یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے۔''

اس مطلب کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ ہمارے لئے واضح اور مشہور ہے کہ عالم خلقت میں مختلف مخلوقات موجود ہیں،ان مخلوقات میں سے ہر ایک کی اپنی زندگی اور بقاء کے لئے ایک مخصوص طریقہ کار اور خاص راستہ معین ہے اور وہ اپنی زندگی کی راہ میں منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ایک معین راستہ پر گامزن ہیں اور ان کی سعادت و خوش قسمتی اس میں ہے کہ اپنی زندگی کی اس راہ میں کسی رکاوٹ سے دوچار ہوئے بغیر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔ دوسرے الفاظ میں اپنی زندگی اور بقاء کے راستے کو اپنے وجود میں پائے جانے والے وسائل اور اسلحوں سے استفادہ کرتے ہوئے کسی رکاوٹ کے بغیر طے کر کے سرانجام تک پہنچ جائیں۔

گیہوں کا دانہ اپنے نباتی سفر میں ایک خاص راستہ طے کرتا ہے۔اس کے داخلی ساخت و ساز کے مطابق موجودہ خاص نظم و اسلحوں، مخصوص حالات و شرائط میں روبہ عمل آتے ہیں اور گندم کے پودے کی نشو و نما کے لئے ضروری عناصر کو معین مقدار اور نسبت میں جذب کر کے گندم کے پودے کی مخصوص راہ پر راہنمائی کر کے اسے منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں۔

گندم کا پودا اپنی نشو و نما کی راہ میں اندرونی اور بیرونی ماحول اور عوامل کے سلسلہ میں جس خاص روش کو اپناتا ہے،وہ کسی صورت میں قابل تغیر نہیں ہے۔مثال کے طور پر کبھی ایسا نہیں ہوتا ہے کہ گندم کا اپنی نشو و نما کا تھوڑا سا راستہ طے کرنے کے بعد ہی اچانک ایک سیب کے درخت میں تبدیل ہو جائے اور اس کی شاخیں،کونپلیں اور پتے نکل آئیں یا اپنی زندگی کی راہ میں ایک پرندہ میں تبدیل ہو کر پرواز کرے۔یہ قاعدہ خلقت کی تمام انواع میں موجود ہے اور انسان بھی اس کلّی قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

انسان بھی اپنی زندگی میں،ایک فطری راہ اور ایک منزل مقصود رکھتا ہے جو اس کا کمال،سعادت اور خوشبختی ہے۔اس کی بناوٹ کچھ ایسے اسلحوں سے مجہّز ہے جو اس کی فطری راہ کو مشخص کرتے ہیں اور اسے حقیقی منافع کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔

خدائے متعال تمام مخلوقات میں موجود اس عمومی راہنمائی کی تعریف میں فرماتا ہے:

...)الذی اعطیٰ کلّ شیٍ خلقہ ثم ھدی)(طہ۔۵۰(

...''خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی مناسب خلقت عطا کی ہے اور پھر ہدایت بھی دی ہے۔(یعنی نفع کی طرف''(

انسان میں موجود خصوصی راہنمائی کے بارے میں فرماتا ہے:

)ونفس وما سوٰھا* فألھمھا فجورھا وتقوٰھا* قد افلح مَن زکھا* وقد خاب مَن دسّٰھا)(شمس۔۷۔۱۰(

''اور نفس کی قسم اور جس نے اسے درست کیا ہے۔پھر بدی اور تقویٰ کی ہدایت دی ہے۔بیشک وہ کامیاب ہو گیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنالیا۔اور وہ نامراد ہو گیا جس نے اسے آلودہ کر دیا ہے۔''

مذکورہ بیان سے واضح ہوتا ہے انسان کی زندگی کا حقیقی راستہ۔کہ جس میں اس کی حقیقی سعادت و خوشبختی ہے۔وہ راستہ ہے جس کی طرف فطرت اس کی راہنمائی کرتی ہے اور یہ انسان اور کائنات کی خلقت کے تقاضوں کے مطابق حقیقی مصلحتوں اور منفعتوں کی بنیاد پر استوار ہے،چاہے یہ اس کے جذباتی

خواہشات کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ جذبات کو فطرت کی راہنمائی کی پیروی کرنی چاہیئے اور اسی کے تابع ہونا چاہیئے نہ کہ فطرت انسان کے نفسانی خواہشات اور جذبات کے تابع ہو۔

انسانی معاشرہ کو بھی اپنی زندگی کو حقیقت پسندی پر استوار کرنا چاہیئے نہ متزلزل توہمات اور دھوکہ دینے والے جذبات کی بنیادوں پر۔ اسلام کے قوانین اور دوسرے ملکی قوانین میں یہی فرق ہے۔ کیونکہ عام اجتماعی قوانین معاشرہ کے افراد کی اکثریت (نصف+۱) کی خواہشات کے مطابق ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام کے قوانین فطرت کی ہدایت کے موافق ہوتے ہیں جو ارادۂ الٰہی کی علامت ہے اور اسی لئے قرآن مجید تشریعی حکم کو خدائے متعال سے مخصوص جانتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

...)إن الحکم إلّا للہ..)(یوسف،۴۰(

...''حکم کرنے کا حق صرف خدا کو ہے۔''

...)ومن أحسن من اللہ حکما لقوم یوقنون)(مائدہ،۵۰(

...''صاحبان یقین کے لئے اللہ کے فیصلہ سے بہتر کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے؟''

اسی طرح جو کچھ ایک عام معاشرہ میں حکم فرما ہوتا ہے وہ یا لوگوں کی اکثریت کی خواہش اور مرضی یا ایک طاقتور مطلق العنان شخص کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے، چاہے یہ حکمرانی حق و حقیقت کے مطابق ہو اور معاشرہ کی حقیقی مصلحتوں کو پورا کرتی ہو یا اس کے برخلاف ہو۔ لیکن حقیقی اسلامی معاشرہ میں حق و حقیقت کی حکومت ہوتی ہے اور لوگوں کو اس کی اطاعت و پیروی کرنی چاہیئے۔

یہاں پر ایک اور شبہ کا جواب بھی واضح ہوتا ہے اور وہ یہ کی ''اسلام انسانی معاشرہ کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ جو انسانی [illegible] آج کل مکمل آزادی سے مالامال اور ہر قسم کی کامیابی و کامرانی سے بہرہ مند ہیں، ہرگز تیار نہیں ہیں کہ اسلام کی اتنی پابندیوں کے تحت رہیں۔''

البتہ اگر ہم بشریت کو موجودہ حالات میں' جبکہ اخلاقی زوال نے انسانی زندگی کے ہر پہلو پر اثر کیا ہے اور ہر قسم کی بے راہ روی اور ظلم و استبداد نے اپنا سایہ ڈالا ہے اور ہر لحہ فنا و زوال کے بادل منڈلا رہے ہیں، فرض کریں اور پھر اسلام کا اس کے ساتھ موازنہ کریں تو ہم واضح اور روشن اسلام اور تاریکی میں ڈوبی بشریت کے درمیان کسی بھی قسم کی مطابقت کو نہیں پائیں گے اور ہمیں توقع بھی نہیں رکھنی چاہیئے کہ اسلام کی موجودہ حالت کو جاری رکھتے ہوئے ،یعنی جزئی طور پر اسلامی احکام کی ظاہری صورت عالم بشریت کی مکمل سعادت کو پورا کرے گی یہ توقع بالکل اس امر کے مانند ہے کہ ہم جمہوریت کا صرف دم بھرنے والی ایک استبدادی اور مطلق العنان حکومت سے حقیقی جمہوریت کے نتائج اور فوائد کی توقع رکھیں یا یہ کہ بیمار ڈاکٹر کے نسخہ لکھنے پر ہی اکتفا کر کے صحت یاب ہونے کی امید میں بیٹھے رہیں۔

لیکن اگر ہم صرف لوگوں کی خداداد فطرت کو مد نظر رکھتے ہوئے اسلام۔ جو دین فطرت ہے۔ سے موازنہ کریں تو ہم اس میں مکمل موافقت اور ہم آہنگی پائیں گے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ فطرت نے جس راستہ کو خود تشخیص دے کر معین کیا ہے اور اس کی طرف ہدایت کرتی ہے اور اس کے علاوہ کسی اور راستہ کو قبول نہیں کرتی ہے، اس کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو؟

البتہ لوگوں کی لاابالی اور بے راہ روی کی وجہ سے پیدا ہوئی گمراہیوں اور کج فہمیوں سے جو آج کل فطرت دوچار ہے اس کی وجہ سے کسی حد تک فطرت اور اس کی معین کردہ طریقہ کار کی شناسائی میں شگاف پیدا ہوا ہے۔ لیکن ان ناگفتہ بہ حالات میں عاقلانہ روش یہ ہے کہ ان ناموافق حالات سے مقابلہ کیا

جائے تاکہ زمینہ ہموار ہو جائے نہ یہ کہ منحرف کی گئی فطرت پر خط بطلان کھینچ کر انسانی سعادت وخوشبختی سے ناامید ہو کر چشم پوشی کریں۔تاریخ گواہ ہے کہ تمام نئی روشیں اور نظام اپنے قیام کی ابتداء میں گزشتہ روشوں اور پرانے حالات سے سختی کے ساتھ نبرد آزما ہوتے ہیں اور بہت سی کشمکشوں۔جو اکثر خوں ریزی پر مشتمل ہوتی ہیں۔کے بعد معاشرہ میں اپنے قدم جما کر اپنے سابقہ دشمنوں کی یاد کو لوگوں کے ذہنوں سے محو کر سکتے ہیں۔

جمہوریت کے تمام نظام جو ان کے طرفداروں کے عقیدہ کے مطابق لوگوں کی مرضی پر مبنی کامیاب ترین نظام ہیں،نے اپنے استحکام کے لئے فرانس اور دنیا کے دوسرے ممالک میں کئی خونیں انقلاب برپا کرنے کے بعد استحکام پایا ہے۔اسی طرح کمیونسٹ نظام۔جو اپنے طرفداروں کی نظر میں بشر کی ترقی یافتہ تحریک اور تاریخ کا عظیم تحفہ ہے۔نے بھی اپنی پیدائش کی ابتداء میں سویت یونین میں پھر ایشیا،یورپ اور لاطینی امریکہ میں لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو خاک وخون میں غلطاں کرنے کے بعد استحکام پایا ہے۔

مجموعی طور پر ایک معاشرہ کی ابتدائی مرحلہ میں ناراضگی اور مزاحمت ایک روش کے نامناسب یا بے بنیاد ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی ہے۔لہذا اسلام ہر حالت میں زندہ ہے اور معاشرے میں رائج ہونے کی قابلیت وصلاحیت رکھتا ہے۔

ہم اس موضوع پر آنے والی بحثوں میں وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالیں گے۔

اسلام اور ہر زمانہ کی حقیقی ضرورتیں

بحث وتحقیق کے بارے میں پیش آنے والے اور نفی واثبات قرار پانے والے علمی مسائل میں سے ہر مسئلہ کی اہمیت اور اس کی حقیقی قدر وقیمت ایک حقیقت کی اہمیت اور قدر وقیمت کے تابع ہے جو ان میں پائی جاتی ہے اور یہ ایسے آثار ونتائج کے تابع ہوتے ہیں جو عمل ونفاذ کے مقام پر ان کی تطبیق اور زندگی کے نشیب وفراز میں ان سے استفادہ کرتے وقت وجود میں آتے ہیں۔

انسان کو کھانا پینا سکھانے والا ایک انتہائی ابتدائی تصور،قدر وقیمت کے لحاظ سے انسان کی زندگی کے برابر ہے۔یعنی اس کی قدر وقیمت وہی زندگی کی قدر وقیمت ہے جو انسان کی نظر میں ایک گراں بہا سرمایہ ہے،اور ایک تصور جو ظاہراً انتہائی معمولی اور مختصر ہے۔جو انسان کے دماغ میں اجتماعی زندگی کی ضرورت کو ایجاد کرتا ہے۔اس کی قیمت وہی ہے جو انسان کے حیرت انگیز نظام کی قیمت ہے جو ہر لحہ انسان کے لاکھوں عمل وحرکات سکنات کو ایک دوسرے سے ربط دے کر ہر روز کروڑوں مطلوب اور نامطلوب اثرات کو پیدا کر کے گوناگوں برُے اور اچھے نتائج کو وجود میں لاتا ہے۔

البتہ اس بات سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ایک مقدس دین۔جیسے دین اسلام۔کا انسان کی ضرورتوں کو ہر زمانہ میں پورا کرنا،اہمیت کے لحاظ سے اول درجہ رکھتا ہے اور یہ انسان کی زندگی کی اہمیت کے برابر ہے کہ ہم اس سے قیمتی تر سرمایہ کا تصور نہیں کر سکتے ہیں۔

البتہ دین اسلام کے بنیادی اصولوں سے کم از کم آگاہی اور دلچسپی رکھنے والا ہر مسلمان اس مسئلہ کو اسلام سے یاد کئے گئے مسائل کی فہرست میں درج کرتا ہے۔

حقیقت میں یہ فکری مادّہ بھی اسلام کے وجود میں لائے گئے دوسرے دینی فکری مادّوں کے مانند صدیوں سے ہم،اسلام کے پیروکاروں کے ذہنوں میں موجود ہے اور وراثت کے طور پر ایک فکر سے دوسری فکر میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور اپنی خاموش زندگی کو جاری رکھے ہوئے ہے اور ہمیشہ دیگر مذہبی مقدسات کے مانند بحث وتمحیص سے دامن بچاتے ہوئے انسانوں کی سرشت میں منتقل ہوا ہے اور اس سے استفادہ نہیں کیا گیا ہے۔

ہم مشرقی ہیں اور جہاں تک ہمیں اپنے اسلاف اور آبا و اجداد کی تاریخ کے بارے میں یاد ہے، شاید ہزاروں سال گزر چکے ہوں گے، گزشتہ اجتماعی ماحول میں۔ ہم پر حکومت کی گئی۔ ہر گز ہمیں فکری، خاص کر سماجی مسائل سے مربوط علمی مسائل میں آزادی نہیں دی گئی اور صدر اسلام میں ایک مختصر مدت میں پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ جو ایک کرن نمودار ہوئی تھی اور طلوع فجر کے مانند ایک نورانی دن کی نوید دیتی تھی چند خود پرستوں اور منافع خوروں کے تاریک حوادث طبیعی اور مصنوعی طوفان کے نتیجہ میں دوبارہ تاریکی کے پردہ میں چلی گئی اور اس کے بعد ہم رہے اور اسیری و غلامی، ہم رہے اور تازیانے ، تلواریں، پھانسی کے پھندے، زندانوں کی کالی کوٹھریاں، اذیت خانے اور مرگ آور ماحول، ہم رہے اور قدیمی فریضہ ''ہاں ہاں'' ''لبیک'' و ''سعدیک!''

جو بہت چالاک تھا وہ اسی حد تک اپنے مذہبی مقدسات کے مادّوں کو محفوظ کر سکتا تھا اور اتفاق سے وقت کی حکومتیں اور معاشرہ کا نظم و انتظام چلانے والے بھی اس رویّہ کے بارے میں آزاد بحث کرنے میں رکاوٹ ڈالنے میں زیادہ بے غرض نہیں تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ لوگ اپنے کام میں مشغول رہیں اور دوسرے امور میں دخل نہ دیں، یعنی وہ صرف اپنے کام میں لگے رہیں، حکومتی اور عمومی امور میں مداخلت نہ کریں کیونکہ ان کی نظر میں یہ امور صرف حکومتوں اور معاشرہ کا نظم و انتظام چلانے والوں کا حق تھا!

وہ لوگوں کے اغلب دینی امور اور نسبتاً سادہ دینی امور کے پابند ہونے میں اپنے لئے کسی قسم کا نقصان نہیں دیکھتے تھے اس لئے اس حالت سے نہیں ڈرتے تھے، وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ لوگ تجسّس اور تنقید پر نہ اتر آئیں اور وہ خود لوگوں کے مفکّر بن کے رہیں۔ کیونکہ انہوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سے درک کیا تھا کہ زندگی میں طاقتور ترین وسائل افراد کے ارادہ کی طاقت ہے اور افراد کا ارادہ قید و شرط کے بغیر ان کے مفکرانہ مغز کے تابع رہے اور مفکروں کے مغز پر تسلّط جما کر ان کے ارادوں پر تسلط جما سکیں، اس لئے وہ لوگوں کے افکار پر تسلط جمانے کے علاوہ کچھ نہیں سوچتے تھے تاکہ ہماری اصطلاح میں خود لوگوں کے مفکر بن کے رہیں۔

یہ حقائق کا ایک ایسا سلسلہ ہے جیسے اپنے اسلاف کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر فرد بڑی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے اور اس کے لئے کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہے گا۔

حال ہی میں یورپ کی آزادی مغرب کو سیراب کرنے کے بعد ہم مشرق زمین کے باسیوں کے ہاں آئی ہے، اس نے ابتداء میں ایک محترم مہمان کی حیثیت سے اور اس کے بعد ایک طاقتور گھر کے مالک کی حیثیت سے ہمارے برّ اعظم میں قدم جمائے ہے۔ اگرچہ اس آزادی نے افکار کے گھٹن کا بوریا بستر گول کر دیا اور آزادی کا نعرہ بلند کیا، یہ ایک بہترین وسیلہ اور مناسب ترین فرصت تھی جو ہمیں اپنی کھوئی ہوئی نعمت کو دوبارہ حاصل کر کے ایک نئی زندگی کی داغ بیل ڈال کر علم و عمل کو حاصل کرنے میں مدد کرتی، لیکن افسوس یورپ کی یہی آزادی، جس نے ہمیں ظالموں سے نجات دلائی، ان ہی ظالموں کی جانشین بن کر ہمارے دل و دماغ پر سوار ہو گئی!

ہم نہ سمجھ سکے کہ کیا ہوا؟ جب ہم ہوش میں آئے تو دیکھا کہ وہ دن گزر گئے تھے جب ہم اپنی حیثیت کے مالک تھے اب خدا اور گزشتہ آسمانی طاقتوں کی باتوں پر توجہ نہیں کرنی چاہئے بلکہ ہمیں صرف اسی طرح عمل کرنا چاہئے جو کچھ یورپی انجام دیتے ہیں اور جس راہ پر وہ چلتے ہیں، اسی راہ پر ہمیں بھی چلنا چاہئے!

ایک ہزار سال سے سر زمین ایران ''بو علی سینا'' کو اپنی آغوش میں لئے ہوئی تھی اور اس کی فلسفی اور طبّی تالیفات ہماری لائبریریوں میں موجود تھیں اور

اس کے علمی نظریات وردزبان تھےاور کوئی خاص خبر نہیں تھی۔

سات سو سال سے ''خواجہ نصیر الدین طوسی'' کی ریاضی کی کتابیں اور ان کے ثقافتی خدمات ہمارا نصب العین تھا اور کہیں اس کی خبر تک نہیں تھی، لیکن ہم نے یورپیوں کے ان کے دانشوروں کے سلسلے میں یادگار منانے کی تقلید کرتے ہوئے ''بو علی سینا'' کے لئے ہزار سالہ یادگار اور '' خواجہ نصیر الدین طوسی'' کے لئے سات سو سالہ یادگاری تقریبیں منعقد کیں۔

تین صدیوں سے زیادہ عرصہ سے ''صدر المتالہین'' کا فلسفی نظریہ ایران میں رائج تھا اور انھیں کے فلسفی نظریہ سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ ایک طرف سے برسوں پہلے تہران یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی گئی ہے اور اس میں قابل توجہ صورت میں فلسفہ پڑھایا جاتا ہے، لیکن جب چند برس پہلے ایک مستشرق نے اس یونیورسٹی میں اپنی تقریر میں ''ملاصدر'' کی تمجید و تعظیم کی اور اس کے فلسفی نظریہ کی تعریفیں کیں تو یونیورسٹی میں اس کی شخصیت اور اس کے فلسفی نظریہ کے بارے میں ایک بے مثال ہلچل مچ گئی۔

یہ اور ان جیسے دوسرے واقعات ایسے نمونے ہیں جو عالمی سطح پر ہماری اجتماعی حیثیت اور ہماری فکری شخصیت کی ہویت کو واضح کر کے بتاتے ہیں کہ ہماری فکری شخصیت طفیلی ہے اور ہمارے فکری سرمایہ میں سے جو کچھ چوروں سے بچا ہے وہ جوتشیوں کے حصہ میں آیا ہے۔

ہم میں سے اکثر لوگوں کے فہم وادراک کا یہی حال ہے۔ اور لوگوں کی جو اقلیت کسی حد تک اپنی فکری آزادی کو محفوظ کر سکی ہے اور اپنے دماغ کے سرمایہ کو مکمل طور پر اغیار کے ہاتھوں لوٹنے سے محفوظ رکھا ہے وہ بھی تعدّد شخصیت کے شکار ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ایک طرف سے مغربی افکار کے دلدادہ اور دوسری طرف سے اپنے مشرقی اور موروثی افکار کے غلام بن گئے ہیں اور کھلم کھلا کوشش کر رہے ہیں کہ ان دو متضاد شخصیتوں کو آپس میں ملادیں۔

ہمارا ایک دانشور مؤلف ''اسلامی ڈیموکریسی'' کے عنوان سے اسلام کی روش کو ڈیموکریسی کی روش سے تطبیق کرتا ہے تو دوسرا ''اسلامی کمیونزم'' کے عنوان سے کمیونزم کی روش اور طبقاتی اختلافات کو دور کرنے کے طریقہ کار کو دین سے نکال کر پیش کرتا ہے۔

ایک عجیب داستان ہے! اگر حقیقت میں اسلام کی فطانت اور حقیقت پسندی صرف اسی میں ہے کہ واضح اور روشن ترین ظاہر داری کے ساتھ ہمارے پاس آئی ہوئی ڈیموکریسی اور کمیونزم کی زندہ روح اس میں ہونی چاہئے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم چودہ سو سال پرانے چند افکار کو انتہائی رنج و محنت کے ساتھ ان سے تطبیق کر کے اپنے سینہ پر لٹکادیں!

اگر اسلام ایک مستقل حقیقت رکھتا ہے اور یہ حقیقت ایک جدا، زندہ اور گراں بہا حقیقت ہے تو کیا ضرورت ہے ہم اس کے خداداد حسن کو بناوٹی سجاوٹ سے پردہ پوشی کریں اور مصنوعی صورت میں اسے خریداروں کے سامنے پیش کریں!

حالیہ چند برسوں کے دوران، یعنی دوسری عالمی جنگ کے بعد مغربی دانشوروں نے ادیان و مذاہب کے بارے میں ایک خاص جوش و جذبہ کے ساتھ بحث و تحقیق کرنی شروع کی ہے اور اپنی تحقیق کے نتائج کو ہر روز منتشر کرتے ہیں اور بے شک ہم بھی، مذکورہ تقلید و تبعیت کے پیش نظر، کم و بیش اسی راہ پر چلتے ہوئے دین مقدس اسلام کے بارے میں چند سوالات کو اپنی گفتگو کا موضوع قرار دیتے ہیں:

کیا دین و مذہب سب حق ہے؟ کیا آسمانی ادیان اجتماعی اصطلاحات کی ایک کڑی کے علاوہ کچھ اور ہے؟ کیا دین روح کی پاکی اور اخلاقی اصلاح کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد رکھتا ہے؟ کیا مذہبی احکام اسی شکل و صورت میں ہمیشہ باقی رہیں گے؟ کیا دین کا عملی احکام کے علاوہ کوئی اور مقصد بھی ہے؟ کیا اسلام ہر زمانہ کی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے؟ کیا اور کیا...

البتہ جب ایک محقق دانشور ایک مسئلہ سے نمٹتا ہے تو وہ سب سے پہلے مسئلہ کو مسلم علمی معیاروں سے تطبیق دے کر اس کی تفسیر کرتا ہے پھر اس کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں بحث کر کے اپنا نظریہ پیش کرتا ہے۔

مغربی دانشور، دین کو ایک اجتماعی مظہر جانتے ہیں، جو خود معاشرہ کے مانند بعض فطری عوامل کا ایک معلول ہے۔

مغربی دانشوروں کی نظر میں تمام ادیان من جملہ اسلام۔ اگر دین کے موضوع کے بارے میں خوش فہم ہوں تو۔ چند غیر معمولی ذہانت رکھنے والے افراد کے آثار ہیں، جنہوں نے اپنے نفس کی پاکی، انتہائی ذہانت اور نا قابل شکست ارادہ کے نتیجہ میں اپنے معاشرہ کے اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لئے کچھ قوانین وضع کر کے لوگوں کی زندگی کی سعادت کی راہ پر راہنمائی کرتے تھے۔ یہ قوانین انسانی معاشروں کے تدریجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ تغیر پیدا کر کے ارتقاء کی آخری منزل تک پہنچتے ہیں۔

حس، تجربہ اور یہی تاریخ ثابت کرتی ہے کی انسانی معاشرہ تدریجی طور پر ارتقاء کی طرف بڑھتا ہے اور عالم بشریت تہذیب و تمدن کے میدان میں ہر روز ایک نیا قدم اٹھاتی ہے اور نفسیاتی، قانونی اور اجتماعی، حتی فلسفی، خاص کر ''ڈیالٹیک میٹریالزم'' فلسفہ کے نتائج کے پیش نظر چونکہ معاشرے ایک ثابت حالت میں نہیں رہتے ہیں اس لئے معاشروں میں قابل نفاذ قوانین بھی ایک حالت میں باقی نہیں رہ سکتے۔

جنگلی میوے کھا کر غاروں میں زندگی بسر کرنے والے ابتدائی انسانوں کی سعادت مند زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے والے قوانین، ہرگز آج کی تکلفاتی زندگی کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔

ڈنڈوں اور کلہاڑیوں سے جنگ کرنے والے زمانہ سے مربوط قوانین، آج کل کے ایٹمی دور کے لئے کسی صورت میں فائدہ مند نہیں ہو سکتے۔

گھوڑوں اور گدھوں پر سفر کرنے والے زمانے سے مربوط قوانین، آج کل کے جٹ ہوائی جہاز اور آب دوز کشتیوں سے سفر کرنے کے زمانے کے کس درد کا علاج کر سکتے ہیں؟

مختصر یہ کی آج کی دنیا نہ اپنے اسلاف کے قوانین کو قبول کرتی ہے اور نہ اس سے ان کو قبول کرنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر انسانی معاشروں میں نافذ ہونے والے قوانین مسلسل قابل تغیر ہیں اور عالم بشریت کے گوناگوں تحوّلات کے مطابق مکمل ہوتے ہیں اور اعمال کے قوانین میں تبدیلیوں کے پیش نظر اخلاق بھی قابل تغیر ہے، کیونکہ اخلاق وہی ثابت نفسانی صورتیں اور ملکہ ہے جو عمل کے تکرار سے وجود میں آتا ہے۔

دو ہزار یا تین ہزار سال قبل خاموش اور سادہ زندگی کو آج کی باریک اور پیچیدہ زندگی کی سیاست قبول نہیں کرتی، آج کے معاشرہ کی خواتین دو ہزار سال پرانی خواتین کی عفت پر عمل نہیں کر سکتی ہیں!

عصر حاضر کے مزدور، کسان اور دوسرے محنت کش طبقے قدیم زمانے کے مظلوم طبقات جیسا صبر و تحمل نہیں رکھ سکتے ہیں۔ فضا کو تسخیر کرنے والے زمانہ سے مربوط انقلابی مغز والے انسان کو سورج گہن، چاند گہن اور سیاہ طوفان سے نہیں ڈرایا جا سکتا اور انھیں توکل اور قضا پر تسلیم و رضا سے قانع نہیں کیا جا سکتا۔

مختصر یہ کہ ہر زمانہ کا انسانی معاشرہ اسی زمانہ کے مطابق و مناسب قوانین اور اخلاق چاہتا ہے۔

دوسری جانب سے اسلام کی دعوت نے ایک روش اور قوانین کے ایک سلسلہ کو مد نظر رکھا ہے، جو انسانی معاشرہ کی سعادت کی بہترین صورت میں ضمانت دیتے ہوئے انسانی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور ''اسلام'' اسی واضح، روشن اور مقدس قوانین کا نام ہے۔ (۱) جیسا کہ ''اسلامی

تحقیقات'' کے عنوان سے ہمارے پہلے مجموعہ میں ''قرآن کی نظر میں دین'' کے موضوع میں مفصل بحث ہوئی ہے۔

بدیہی ہے کہ اس قسم کی روش اور قوانین ہر زمانہ میں مختلف مظاہر رکھتے ہیں ان میں خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روش اور قوانین بھی ہیں جنھیں آپؐ اپنے زمانہ میں نافذ فرماتے تھے۔ دوسرے زمانوں میں بھی اسلام کے مظاہر بہترین اور مقدس ترین روش اور قوانین ہوں گے جو اس زمانے کے انسانی معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔

اس بیان سے واضح ہوا کہ اس بحث میں مسلم علمی معیاروں پر تکیہ کرنے کے ضمن میں مغربی دانشور کا جواب مثبت ہوگا، لیکن مذکورہ تفسیر کے ضمن میں اس کی نظر میں اسلام ایک ابدی دین الہی ہے جو ہر زمانہ میں اس زمانہ کے معاشرہ کی سعادت کو ضمانت بخشنے کے لئے بعض قوانین کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

لیکن دیکھنا چاہئے کہ کیا اسلام کی آسمانی کتاب اور اس مقدس دین کے مقاصد کا بہترین ترجمان قرآن مجید بھی، نبوت کو مذکورہ معنی میں اور آسمانی دین کو اسی ترتیب سے۔ جیسے اجتماعی، نفسیاتی، فلسفی اور مادی بنیادوں پر تکیہ کر کے تعبیر کی گئی ہے۔ تفسیر کرتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس زمانہ کے مطابق اس سے مخصوص کچھ جدا قوانین کو قبول کرتا ہے اور اگر اس کے برعکس کچھ ثابت اور ناقابل تغیر عقائد اخلاق اور قوانین کو وضع کر کے انسانی معاشرہ کو ان پر عمل کرنے کے لئے مکلف کرتا ہے، تو انھیں کیسے مختلف زمانوں کے لوگوں کی ضرورتوں سے تطبیق کیا جا سکتا ہے؟

کیا قرآن مجید یہ چاہتا ہے کہ انسانی معاشرہ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ثابت حالت میں رہے اور تہذیب و تمدن پر ترقی کے راستے مکمل طور پر بند رہیں اور انسان کی روز مرہ فعالیت مکمل طور پر سربستہ رہے؟ یہ رواں فطرت اور عالم بشریت کے فطری نظام، سے مقابلہ کے مقام پر، جو اس کی حکومت کے قلمرو سے خارج نہیں ہے، کیسے نکلا ہے؟

یہ امر مسلم ہے کہ قرآن مجید اپنے بنیادی بیان سے آسمانی دین کے موضوع اور عالم غیب سے سرچشمہ حاصل کرنے، نظام خلقت اور اس مشہور دنیا سے رابطہ دینی احکام کے دائمی اور ثابت ہونے، انسانی اخلاق، ایک فرد یا انسانی معاشرہ کی خوش بختی و بد بختی کے بارے میں اس طرح وضاحت کرتا ہے جو ایک مغربی دانشور کی مذکورہ وضاحت سے مختلف ہے، ان مطالب کو قرآن مجید کی نظر سے دوسری صورت میں دیکھا جاتا ہے جبکہ بصری وسائل، مادی بحثوں کو دکھاتے ہیں۔

قرآن مجید دین اسلام کے طریقہ کار اور قوانین کو مسائل و احکام کا ایک ایسا سلسلہ جانتا ہے جو نظام خلقت، خاص کر انسان کی خلقت کو اسی اپنی متحول فطرت سے۔ جو عالم فطرت کا جز تھا اور لحہ بہ لحہ اپنے وجود میں تغیر پیدا کرتا ہے۔ اپنی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں قرآن مجید، اسلام کو قوانین کا ایک ایسا سلسلہ جانتا ہے کہ نظام خلقت کا تقاضا اس کے مطابق ہے اور اپنی بنیاد کی طرح ناقابل تغیر ہے اور کسی کی نفسانی خواہشات کے تابع نہیں ہے، اسلام کے یہ قوانین، حق کو مجسّم جاننے والے قوانین، جیسے استبدادی اور مطلق العنان ممالک کے قواعد وضوابط، جو ایک ڈیکٹیڑ اور حاکم کی مرضی یا اکثریت کے مرضی کے مطابق اشتراکی ممالک کے قوانین کی طرح متغیر نہیں ہوئے ہیں، اور صرف ان کے وضع اور تشریع کی زمام نظام خلقت کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے الفاظ میں، خالق کائنات کے ارادہ کے تابع ہے۔ ہم اس مطلب کی تفصیلی وضاحت اس بحث کے دوسرے حصہ میں پیش کریں گے۔

اسلام، ہر زمانہ کی ضرورتوں کو کیسے پورا کر سکتا ہے؟

اجتماعی بحثوں کے دوران اس نکتہ کا کافی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ انسان اپنے ارد گرد موجودہ حیاتی ضرورتوں کے پیش نظر ان کو تنہا پورا نہیں کر سکا ہے اور اپنی زندگی کی ضرورتوں کو یکہ وتنہا پورا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا، اس لئے اس نے مجبوراً اجتماعی اور معاشرتی زندگی کا انتخاب کیا ہے، جس کے نتیجہ میں ایک شہر یا معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح ہم نے قانونی بحثوں میں بھی بہت سنا ہے کہ معاشرہ اپنے افراد کی زندگی کی ضرورتوں کو حقیقت میں اسی وقت پورا کر سکتا ہے جب ان کی ضرورتوں کے متناسب کچھ قوانین وجود میں آکر حکمرانی کریں تاکہ ان کے سایہ میں معاشرہ کا ہر فرد اپنے حقوق کو حاصل کر سکے اور زندگی کی سہولتوں اور امکانات سے استفادہ کر سکے اور افراد کی اجتماعی کارکردگی کے نتائج سے معاشرہ کے منعقد ہونے اور قوانین کی پیدائش کے سبب اپنا حصہ حاصل کرے۔

چنانچہ ان ہی دو نکتوں سے استفادہ کیا جاتا ہے کہ ،اجتماعی قوانین کے اصلی عامل وہی انسان کی حیاتی ضرورتیں ہیں کہ انسان ان کو پورا کئے بغیر ایک لمحہ کے لئے زندگی گزانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ معاشرہ کی تشکیل اور قانون کی پیدائش اور اس کے بروقت نفاذ کا براہ راست نتیجہ انہی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے ۔بدیہی ہے کہ جو معاشرہ اجتماعی طور پر کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اقدام نہ کرے ،یعنی اس معاشرہ میں انفرادی کام دوسرے افراد سے کوئی ربط نہ رکھتے ہوں، تو اسے معاشرہ کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح جن قوانین کا وجود میں آنا یا ان کا نفاذ، لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور ان کی خوشبختی اور سعادت کا سبب بننے میں کوئی اثر نہ رکھتے ہوں، وہ حقیقی قوانین یعنی لوگوں کی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور ان کے حقوق کا تحفظ کرنے والے قوانین نہیں کہلاتے۔ ایسے قوانین وضوابط کا وجود ضروری ہے جو کم وبیش ، مکمل طور پر یا ناقص صورت میں معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں اور لوگوں کے لئے قابل قبول ہوں۔ ان قوانین کی ہر انسانی معاشرہ میں حتی وحشی اور پسماندہ معاشروں میں بھی ضرورت ہوتی ہے۔ منتہی پسماندہ معاشروں کے قوانین اور قومی ضوابط عادات اور رسوم کی صورت میں غیر منظم تصادم کے نتیجہ میں تدریجاً وجود میں آتے ہیں، یا ایک آدمی کے بیہودہ ارادوں کے ذریعہ یا چند طاقتور لوگوں کی طرف سے لوگوں پر ٹھونسے جاتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر اجتماعی زندگی کا اغلب حصہ تمام یا اکثر لوگوں کے لئے ایک واضح اور قابل قبول اصول پر مستحکم ہوتا ہے۔ اس وقت دنیا کے گوشہ وکنار میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو قومی آداب ورسوم پر زندگی بسر کرتے ہیں بدون اس کے کہ ان کی اجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھر جائے۔

ترقی یافتہ معاشرے میں، اگر معاشرہ دینی ہو تو آسمانی شریعت حکومت کرتی ہے اور اگر معاشرہ غیر دینی ہو تو ان قوانین پر عمل درآمد ہوتا ہے جنھیں معاشرہ کے اکثر لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ وجود میں لاتے ہیں۔ بہر حال ایک ایسے معاشرہ کا سراغ نہیں مل سکتا ہے جس کے افراد کسی نہ کسی قسم کے قوانین وضوابط کے پابند نہ ہوں اور ایسا معاشرہ پیدا کرنا مشکل ہے۔

اجتماعی اور انسانی ضرورتوں کی تشخیص کا وسیلہ

چنانچہ معلوم ہوا کہ قوانین اور ضوابط کا اصلی عامل زندگی کی ضرورتیں ہیں۔ لیکن دیکھنا چاہئے ان ضرورتوں۔ جو در حقیقت وہی اجتماعی اور انسانی ضرورتیں ہیں۔ کو کس طرح تشخیص دی جائے۔

البتہ یہ ضرورتیں انسان کے لئے بالواسطہ یا بلاواسطہ قابل تشخیص ہونی چاہئیں اگر چہ اجمالی اور کلّی طور پر ضمناً یہ سوال پید ہوتا ہے کی کیا انسان اپنی زندگی اور اجتماع کی تکالیف کی تشخیص میں بھی کبھی خطا سے دوچار ہوتا ہے یا جس چیز کو بھی تشخیص دیدے اسی میں اس کی سعادت وخوشبختی ہوتی ہے اور اسے چون چرا کے بغیر قبول اور نافذ کرنا چاہئے ؟یعنی انسان کی وہی چاہت ،اس کے حقیقی ہونے کی صورت میں ،اسے ضروری طور پر قبول اور نافذ کرنے کی لیبل لگادے گی۔

لیکن آج کی ترقی یافتہ دنیا کی اصطلاح میں دنیا کے اکثر لوگ انسان کی چاہت کو قانون کی تشخیص دینے والی چیز بتاتے ہیں، لیکن اس کے پیش نظر کہ ایک ملت کے تمام افراد کی چاہت یا بالکل یکساں نہیں ہوتی یا اگر کہیں توافق پیدا ہو جائے تو وہ بہت کم اور اختلافی موارد کے مقابلہ میں ناچیز ہوتا ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے، لہذا مجبوراً لوگوں کی اکثریت (نصف بعلاوہ ایک) کو قابل اعتبار جان کر اقلیت (نصف منہای ایک) کو مسترد کر کے اقلیت کی آزادی

کو پائمال کیا جاتا ہے۔

البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انسان کے ارادہ اور چاہت کا اس کی زندگی کے حالات سے براہ راست ربط ہوتا ہے۔ایک امیر آدمی، جو اپنی ضروریات کو پورا کرتا ہے، اپنے دماغ میں ہزاروں آرزوئیں رکھتا ہے کہ ایک مفلس و حاجتمند کے ذہن میں یہ آرزوئیں پیدا بھی نہیں ہو سکتی ہیں۔یا بھوک کی وجہ سے جس شخص نے اپنا تاب و تحمل کھو دیا ہو، وہ ہر لذیذ اور غیر لذیذ کھانے کو کھالیتا ہے، اگرچہ وہ کسی اور کا مال بھی ہو۔جب کہ امیر آدمی ناز و نخروں سے صرف لذیذ کھانوں کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔انسان آرام و آسائش کی حالت میں اپنے ذہن میں بہت سے خیالات کو پاتا ہے جن کا سختی اور مشکلات میں تصور تک نہیں کرتا!

اس لحاظ سے اجتماعی زندگی کی ترقی کے پیش نظر انسان کی ضرورتیں تدریجاً بدل جاتی ہیں اور ان کی جگہ پر دوسری ضرورتیں جانشین ہوتی ہیں اور انسان قوانین کے ایک سلسلہ کے اعتبار اور نفاذ سے بے نیاز ہو کر نئے اور دوسرے قوانین وضع اور نافذ کرنے یا پرانے قوانین میں تبدیلی لانے پر مجبور ہوتا ہے ۔اس لئے زندہ قوموں میں پرانے قوانین مسلسل بدلتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے قوانین لیتے ہیں۔یہ بات واضح ہوئی کہ اس کی حقیقی علت یہ ہے کہ قوانین کو وجود میں لانے والا اور اس کی حمایت کرنے والا سبب ملت کے افراد کی اکثریت کی چاہت ہے اور یہی اکثریت کی مرضی قوم کے قواعد وضوابط کو قانونی شکل دے کر ان پر حقیقت کی مہر لگا دیتی ہے، حتی اگر ان کے معاشرہ کی حقیقی مصلحت ان قوانین میں نہ ہو، کیونکہ مثال کے طور پر فرانس کا ایک شخص فرانسیسی معاشرہ میں اس معاشرہ کا رکن اور جز اور اکثریت کے موافق ہونے کے ناطے محترم ہے اور مثال کے طور پر فرانس کا قانون جو چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک فرانسیسی فرد کو تحفظ بخشے اور وہ بھی بیسویں صدی میں نہ یہ کہ ایک برطانوی فرد کی یا ایک فرانسیسی فرد کی دسویں صدی میں (قابل غور بات ہے!) اس سلسلہ میں بیشتر غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا مذکورہ عامل انسان کی خواہشات میں مؤثر ہے اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں ہر لحاظ سے تبدیلی آتی رہتی ہے۔؟

اور یا پوری تاریخ بشریت میں انسانی معاشروں کے درمیان کوئی مشترک پہلو باقی نہیں رہتا ہے؟

یا اصل انسانیت۔جبکہ فطرتاً زندگی کی چند ضرورتیں اس سے مربوط ہیں (چنانچہ کچھ دوسری ضرورتیں مختلف علاقوں اور زندگی کے مراکز کے حالات اور ماحول کے مختلف ہونے سے مربوط ہوتی ہیں) ۔تدریجاً بدل گئی ہے؟اور پہلا انسان مثلاً آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں، دماغ، دل، گردے، پھیپھڑے، جگر اور نظام ہاضمہ کے اعضاء۔وہم میں پائے جاتے ہیں۔نہیں رکھتا تھا یا ان اعضاء کی سرگرمی ایک دن ایسی نہیں تھی جیسی آج پائی جاتی ہے؟

کیا گزرے ہوئے لوگوں کو پیش آنے والے حالات، جیسے جنگ وخون ریزی اور صلح و آشتی کے معنی انسان کو نابود کرنے یا اسے محفوظ رکھنے کے علاوہ کچھ اور تھے؟

کیا شراب پینے کی صورت میں پیدا ہونے والی مستی، مثلاً (شراب کے افسانہ کے موجد) ''جمشید'' کے زمانہ میں آج کے زمانہ میں رکھنے والے مفہوم کے علاوہ کچھ اور مفہوم رکھتی تھی؟اور اسی طرح کیا، ''نکسیا''اور''باربد''جیسے موسیقی کاروں کی موسیقی کی لذت آج کی موسیقی کی لذتوں کے علاوہ کچھ اور تھی؟

مختصر یہ کہ کیا گزشتہ انسان کے وجود کی پوری بناوٹ آج کے انسان کی بناوٹ سے بالکل مختلف تھی؟یا قدیم انسان کے اندرونی اور بیرونی حالات آثار، عمل اور ردّ عمل، آج کے انسان کے علاوہ کچھ اور تھے؟

البتہ ان تمام سوالات کے جوابات منفی ہیں۔ کسی بھی صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت تدریجاً نابود ہو گئی ہے اور کوئی اور چیز اس کی جانشین بن گئی ہے یا جانشین ہو گی، یا یہ کہ اصل انسانیت جو سیاہ فام و سفید فام، بوڑھے جوان، عقلمند اور بیوقوف، قطب میں رہنے والے اور خط استوا پر رہنے والے اور پرانے زمانے کے انسان اور آج کے انسان میں مشترک ہے، مشترک ضروریات نہیں رکھتی۔ یا اگر یہ ضروریات مشترک بھی ہوں تو انسان کی خواہش اور ارادہ ان کو پورا کرنے سے مربوط نہیں ہے۔

جی ہاں، حقیقت میں یہ ضرورتیں موجود ہیں اور کچھ ثابت اور دائمی قوانین کی متقاضی بھی ہیں جن کا بدلنے والے قوانین سے کوئی ربط نہیں ہے، کوئی بھی قوم کسی بھی زمانہ میں اس کی زندگی کے لئے قطعی طور پر خطرہ بننے والے دشمن سے ممکن صورت میں جنگ کرنے سے گریز نہیں کرتی اور اگر ایسے دشمن سے نجات پانے کے لئے اسے قتل کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نظر نہ آئے تو خوں ریزی برپا کرنے سے پیچھے نہیں رہتی۔

مثلاً کوئی معاشرہ اپنے افراد کی زندگی کے لئے ضروری تغذیہ کو نہیں روک سکتا ہے، یا ان کے جنسی تمایلات پر پابندی نہیں لگا سکتا ہے۔ اس قسم کے بہت سے نمونے موجود ہیں جو نا قابل تغیر احکام کی نشاندہی کرتے ہیں اور قابل تغیر احکام سے ان کا کوئی ربط نہیں ہوتا۔

مذکورہ بیانات سے چند موضوع واضح ہو جاتے ہیں :

۱۔ معاشرہ اور اجتماعی قوانین وضوابط کی پیدائش کا اصلی عامل زندگی کی ضروریات ہیں۔

۲۔ تمام اقوام حتی وحشی قومیں بھی اپنے لئے کچھ قوانین اور ضوابط رکھتی ہیں۔

۳۔ موجودہ دنیا کی نظر میں زندگی کی ضرورتوں کو تشخیص دینے والا وسیلہ معاشرہ کے لوگوں کی اکثریت کی مرضی ہے۔

۴۔ اکثریت کی رائے ہمیشہ حقیقت کے مطابق نہیں ہوتی۔

۵۔ زمانہ کے گزرنے اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ کچھ قوانین بدلتے رہتے ہیں اور یہ قوانین خاص حالات سے مربوط ہوتے ہیں، لیکن قوانین کا ایک اور سلسلہ جو ''انسانیت'' کی بنیاد سے مربوط اور تمام ادوار کے انسانوں اور تمام شرائط اور ماحول میں مشترک ہیں، نا قابل تغیر ہیں۔ اب جبکہ یہ موضوعات واضح ہو گئے، ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کا نظریہ کیا ہے؟

تربیت کے بارے میں اسلام کا نظریہ

اسلام، چونکہ ایک عالمی دین ہے اور ایک خاص جماعت اور ایک معین زمان و مکان کو مد نظر نہیں رکھتا ہے، اس لئے اس نے اپنی تعلیم و تربیت میں ""فطری انسان"" کو مد نظر رکھا ہے، یعنی اس نے اپنی نظر کو صرف انسانیت کی مخصوص بناوٹ پر متوجہ کیا ہے، جس میں ایک عادی اور عمومی انسان کے شرائط جمع ہو کر انسان کا مصداق بنتا ہے، اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ عرب ہو یا عجم، سیاہ فام ہو یا سفید فام، فقیر ہو یا امیر، طاقتور ہو یا کمزور، عورت ہو یا مرد، بوڑھا ہو یا جوان اور دانا ہو یا نادان۔

""فطری انسان""یعنی جو انسان خداداد فطرت کا مالک ہو اور اس کا شعور وارادہ پاک ہو و توہمات اور خرافات سے آلودہ نہ ہوا ہو، اسے ہم ""فطری انسان کہتے ہیں""

اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انسان کا دوسرے حیوانوں سے صرف یہ امتیاز ہے کہ انسان اپنی طاقت سے مسلح ہے اور زندگی کی راہ طے کرنے میں ""عقل و شعور"" سے کام لیتا ہے، جبکہ دوسرے حیوانات اس خداداد نعمت سے محروم ہیں۔

ہر جاندار کی سرگرمی۔ بجز انسان کے۔ یک ایسے شعور ارادہ پر منحصر ہے کہ جس کا عامل صرف اس حیوان کے جذبات ہیں جو اپنے ظہور اور جوش سے اسے اس کے مقاصد کی طرف راہنمائی کرتے ہیں اور اسے فیصلہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور اس ارادہ کے نتیجہ میں وہ اپنی زندگی کی سرگرمیوں کو بروئے کار لا کر آب وغذا اور زندگی کی دوسری ضروریات کے پیچھے جاتا ہے۔

یہ صرف انسان ہے، جو مہر و محبت، کینہ وعداوت دوستی ودشمنی اور خوف وامید کے شدید جوش وجذبہ اور جذب ودفع کے بارے میں ہر قسم کے دوسرے جذبات کے علاوہ ایک عدالتی نظام سے بھی مسلح ہے، جو مختلف جذبات اور طاقتوں اور حقیقی مصلحتوں کے درمیان دعوی کی تحقیق کر کے عمل کی تشخیص دے کر اس کے مطابق فیصلہ دیتا ہے۔ کبھی جذبات کی شدید خواہش کے باوجود اس کے برخلاف فیصلہ سناتا ہے اور کبھی قدرت اور جذبات کی کراہت کے باوجود حق میں فیصلہ سناتا ہے اور انسان کو سرگرمی پر مجبور کرتا ہے اور کبھی ان جذبات اور طاقت کی مصلحتوں پر توافق اور ان کی خواہش سے موافقت کا اعلان کرتا ہے۔

اسلام میں تعلیم و تربیت کی بنیاد

اسی اصول پر کہ ہر نوع کی مکمل تربیت اس نوع کی امتیازات اور مشخصات کی پرورش سے انجام پانی چاہئے، اسلام نے اپنی تعلیم و تربیت کی بنیاد کو جذبات و احساسات کے بجائے ""تعقل"" کے اصول پر استوار کیا ہے۔ اسی لئے اسلام میں دین کی دعوت، مقدس عقائد کے ایک سلسلہ، اعلی اخلاق اور عملی قوانین کی طرف ہے، فطری انسان اپنی، بے لاگ اور توہمات و خرافات سے خالی اپنی خداداد عقل سے، اسی کی حقیقت اور صحیح ہونے کی تائید کرتا ہے۔

فطری انسان کی قوّت فہم

فطری انسان اپنی خداداد قدرت سے سمجھتا ہے کہ یہ عظیم اور وسیع کائنات ایٹم جیسے سب سے چھوٹے ذرّات سے لے کر عظیم کہکشانوں تک، ایک حیرت

انگیز نظام اور اپنے دقیق ترین قوانین کے تحت خدائے واحد کی طرف پلٹتی ہے اور اس کائنات کی پیدائش اور اس کی پیدائش کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے آثار، خاصیتیں اور ان کی بے شمار سر گرمیاں سب کی سب خدائے متعال کی مخلوق ہیں۔

فطری انسان سمجھتا ہے کہ کائنات، ان تمام پراکندہ اور منتشر اجزاء کے باوجود ایک عظیم اکائی کو تشکیل دیتی ہے، جس میں تمام اجزاء ایک دوسرے سے مرتبط ہیں اور تمام چیزیں (قطعی طور پر) دوسری تمام چیزوں میں دخل دیتی ہیں اور ان کے درمیان مکمل ہم بستگی ہماری فکر کے مطابق ہے۔

عالم بشریت۔ جو کائنات کا ایک چھوٹا جز اور اس بحر بیکراں کا ایک معمولی قطرہ ہے۔ ایک ایسا مظہر ہے، جس کی تخلیق میں پوری کائنات کا رول ہے اور حقیقت میں پوری کائنات انکی بناوٹ خالق کائنات کے ارادہ کی تخلیق ہے۔

چنانچہ انسان خالق کائنات کی مخلوق ہے اور خالق کائنات کی رہنمائی و تربیت کے سایہ میں زندگی بسر کرتا ہے، یہ خالق کائنات ہی ہے، جس نے بے انتہا عوامل کو بروئے کار لا کر انسان کو اس صورت میں پیدا کیا ہے۔ اور یہ وہی پروردگار ہے جس نے انسان کو خاص اندرونی اور بیرونی قوتوں اور وسائل سے مسلح کیا ہے اور یہ وہی ہے جو انسان کو گوناگوں وسائل، قوتوں، جذبات، عقل اور آخر کار شعور و ارادہ کے ذریعہ اس کی حقیقی سعادت کی ضمانت دینے والے مقاصد کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

حقیقت میں انسان ایک باشعور اور باارادہ مخلوق ہے، جو نیک و بد اور نفع و نقصان میں تمیز کر سکتا ہے، نتیجہ کے طور پر یہ ''فاعل مختار'' ہے، لیکن اس نکتہ سے غافل نہیں رہنا چاہئے کہ کائنات کی خلقت خالق کائنات کا ارادہ ہے، جس نے یہ سب نقش و نگار انسان کے اندر اور باہر کھینچ لئے ہیں اور اسے ایک صاحب اختیار مظہر کے طور پر خلق کر کے آزاد بنا دیا ہے۔

بیشک ان ہی افکار کے پیش نظر مادی انسان عقل و شعور کے ذریعہ سمجھتا ہے کہ اس کی سعادت و خوشبختی، دوسرے الفاظ میں اس کی زندگی کا حقیقی مقصد، وہی منزل ہے، جسے اس کو پیدا کرنے والے خالق کائنات نے اس کے لئے تشخیص دی ہے اور اسے خلقت کے وسائل کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور یہ مقصد بھی وہی چیز ہے جسے خدائے واحد اور کائنات و انسان کے خالق نے اس کے لئے مصلحت سمجھی ہے۔ (غور کیا جائے(

ان تمہیدات کے بعد مادی انسان کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ زندگی کی راہ میں تنہا خوشبختی اور سعادت اسی میں ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی خلقت کی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو کائنات کے خالق حقیقی یعنی خدائے متعال کی حکومت کے تحت جان لے اور اس حالت سے ہر گز غفلت نہ کرے اور ہر حرکت و آرام اور ہر سر گرمی کے مقابلہ میں خلقت کی کتاب سے واجب العمل احکام کو پڑھ کر انھیں وقت پر نافذ کرے۔

مختصر یہ کہ اس کتاب کے بے شمار احکام یہ ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں خدائے یکتا کے علاوہ کسی کے سامنے خضوع اور اپنے آپ کو حقیر نہ بنائے اور انسانی جذبات و خواہشات کے تقاضوں کو عقل کی تائید کی شرط پر انجام دے۔

ثابت اور متغیّر قوانین

انسان کی نظر میں احکام و قوانین کی صورت میں مجسم ہونے والے تقاضے دو مختلف حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں :

ا۔ انسان کے حیاتی منافع کا تحفظ کرنے والے احکام و ضوابط (اس لحاظ سے کہ وہ انسان ہے اور ہر زمان و مکان میں جن حالات کے ساتھ بھی اجتماعی صورت میں زندگی بسر کرتا ہے۔) ہر عقائد و قوانین کے ایک حصہ کے مانند جو انسان کی عبودیت اور خضوع کو اس کے پروردگار کی نسبت (جس میں کسی قسم کا تغیر یا زوال ممکن نہیں ہے) مجسم کرتا ہے۔ اور قوانین کے ان کلیّات کے مانند جن کے بارے میں انسان اپنی اجتماعی زندگی کے اصول، جیسے کھانا، گھر، ازدواج

اور دفاع کے سلسلہ میں ان کا نیاز مند ہے۔

۲۔ وہ احکام اور قوانین جو عارضی، مقامی یا دوسری خصوصیت رکھتے ہوں اور زندگی کے طور طریقوں میں اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں البتہ یہ حصہ، تہذیب و تمدن کی ترقی، معاشروں کی صورت میں تغیر و تبدیلی رونما ہونے اور نئی اور پرانی روشوں کے وجود میں آنے اور نابود ہونے کے پیش نظر قابل تغیر ہے۔

مثال کے طور پر، انسان ایک زمانہ میں پیدل اور گھوڑے، گدھے اور خچر پر سفر کر کے ہر راستے کو طے کر کے ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں جاتا تھا اور سادہ راستوں کے علاوہ اسے کسی قسم کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، جبکہ موجودہ زمانہ کے وسیلے ہزاروں باریک اور پیچیدہ شہری، بیابانی، سمندری اور ہوائی قوانین کے متقاضی ہیں۔

ابتدائی انسان، جو سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور اس کا سروکار تقریباً ابتدائی چیزوں اور سادہ قوانین سے تھا، جن سے وہ اپنی ضرورت، جیسے خوراک، لباس، گھر اور جنسی خواہشات کو پورا کرتا تھا، اگر چہ وہ اپنا پورا وقت کم نتیجہ اور پر محنت کام میں صرف کرتا تھا، لیکن آج تیز رفتار طریقہ پر اپنی زندگی کی راہ کو طے کرتا ہے اور کام کی عجیب کثرت اور فشردگی کی وجہ سے وہ کام کو مختلف اور خصوصی شعبوں میں تقسیم کرنے پر مجبور ہوا ہے اور اس کے ہزاروں زاویے پیدا ہوئے ہیں جو روزانہ ہزاروں قوانین کے ساتھ رونما ہوتے ہیں۔

اسلام نے اپنے تربیتی نظریہ کو فطری انسان سے منحصر کیا ہے اور اپنی دعوت سے انسانی معاشرہ کو پاک فطری اعتقاد، پاک فطری عمل اور پاک فطری مقصد رکھنے والے پاک فطری معاشرہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے، اور اعتقاد و عمل میں اس کے بے داغ افکار نے، فطری انسان کو اپنے واجب العمل پروگرام کے تحت قرار دیا ہے۔ اور نتیجہ کے طور پر اپنے قوانین کو ثابت اور متغیر، دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ جو انسان کی خلقت اور اس کے خصوصی مشخصات کی بنیاد پر مستحکم ہے اسے "دین و شریعت اسلامی" کہا جاتا ہے اور اس کی شعائیں انسان کو انسانی سعادت کی طرف راہنمائی کرتی ہیں:

)فأقم وجهک للدّین حنیفاً فطرت اللہ التی فطر النّاس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدّین القیّم (...

)روم، ۳۰(

"آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے، یقیناً یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے "...

اس کے ضمن میں جاننا چاہئے کہ دوسرا حصہ، جو قابل تغیر قوانین پر مشتمل ہے، اس میں مختلف زمان و مکان کی مصلحتوں کے مطابق تبدیلی پیدا ہوتی ہے ، اور ولایت عامہ کے آثار کے عنوان سے، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے منصوب شدہ جانشینوں کے نظریہ پر پابند ہیں۔ دین کے ثابت اور ناقابل تغیر قوانین کے سائے میں زمان و مکان کی مصلحتوں اور تقاضوں کے مطابق قابل تغیر قوانین کو تشخیص دے کر انھیں نافذ کرتے ہیں۔

البتہ اس قسم کے قوانین دینی اصطلاح میں آسمانی احکام اور شریعتیں شمار نہیں ہوتے اور انھیں دین نہیں کہا جاتا ہے:

)یا أیّھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرّسول و اُولي الأمر منکم ...)(نساء، ۵۹(

"ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمھیں میں سے ہیں"...

یہ ہے اسلام کا ہر زمانہ کی حقیقی ضرورتوں کے بارے میں ایک اجمالی جواب پھر بھی اس مسئلہ کے بارے میں بیشتر وضاحت اور مزید تحقیق اور تجسس کی

ضرورت ہے۔ ہم آئندہ بحث میں اس کی مزید وضاحت کر کے مسئلہ کو واضح تر کریں گے۔

اسلام میں ثابت اور متغیّر قوانین

''اسلام ہر زمانہ کی واقعی ضرورت کو پورا کرتا ہے'' کے عنوان سے گزشتہ بحث میں ہم نے اجمالی طور پر جان لیا کہ اسلام اپنے قوانین کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کرتا ہے: ثابت اور متغیّر قوانین۔

ثابت قوانین

ثابت قوانین، وہ قواعد وضوابط ہیں، جن کو وضع کرنے میں مادی انسان کی حقیقت کو مد نظر رکھا گیا ہے، یعنی انسانی فطرت خواہ شہری ہو یا بیابانی، سیاہ فام ہو یا سفید فام، طاقتور ہو یا کمزور، ہر علاقہ اور ہر زمانہ میں اپنی زندگی کی بساط کو پھیلاتی ہے۔ چونکہ انسانی فطرت انسانی بناوٹ سے بنی ہوئی ہے اور انسان کی اندرونی اور بیرونی قوّتوں اور آلات سے مسلح ہے، اس لئے جب دو افراد یا اس سے زیادہ آپس میں جمع ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر کے اجتماعی زندگی شروع کرتے ہیں، تو خواہ نخواہ ضرورتوں کے ایک سلسلہ سے دوچار ہوتے ہیں کہ جنھیں پورا کرنے کے لئے انھیں اقدام کرنا چاہئے، چونکہ ان کے وجود کی عمارت یکساں ہے اور وہ انسانیت کی خصوصیت میں بھی یکساں ہیں، بیشک ان کی ضرورتیں بھی مشترک اور یکساں فطرت رکھتی ہیں، اس لئے انھیں یکساں قوانین کی ضرورت ہوتی ہے۔

انسان کے استدلالی ادراک تمام افراد میں (جیسا کہ ہم جانتے ہیں) یکساں ہیں اور ان کا عقلی فیصلہ۔ ان کے افکار میں توہمات اور خرافات داخل نہ ہونے کی صورت میں۔ یکساں ہوتا ہے، اور تمام افراد میں ادراک کی طاقت کو تصدیق واعتقاد سے مطمئن کرنا چاہئے۔

اسی طرح، محبت و کینہ، ترس و امید، روٹی اور پانی کی ضرورت، جنسی خواہشات اور لباس و مسکن جیسے گوناگوں جذبات تمام لوگوں میں موجود ہیں، جس صورت میں ایک شخص کے لئے ان ضرورتوں کو پورا کیا جانا چاہئے، اسی صورت میں دوسرے لوگوں کی ان ضرورتوں کو بھی پورا کیا جانا چاہئے انسان کی مشترک فطرت کے پیش نظر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ایک شخص کی بھوک کو دور کرنا جائز ہے اور دوسرے کی بھوک کو دور کرنا منع ہے۔ یا یہ کہ

ایک شخص کواپنی عقل کے اضطراری فیصلہ کے سامنے تسلیم ہوناچاہئے لیکن دوسرے فرد کواپنے ضمیر کے فیصلہ پر توجہ نہیں کرنی چاہئے؟ یایہ کہ انسانی فطرت کواپنی خصوصیت اور مخصوص آثار۔ کہ ہزاروں برسوں سے قوتوں، جذبات اور شعور کے لحاظ سے ایک مشابہ روش پر چلتے ہیں۔ کوایک زمانہ میں اپنے ضروری ادراک وضمیر پراعتماد کرناچاہئے اور دوسرے زمانہ میں انھیں باطل قرار دیناچاہئے۔

انسان ایک دن اجتماعی زندگی بسر کرے اور دوسرے دن انفرادی زندگی اختیار کرے، ایک وقت اپنے مقدسات کادفاع کرے اور دوسرے وقت اپنی پوری ہستی کودشمن کے حوالے کردے، ایک زمانہ میں اپنی زندگی کی سرگرمیوں میں لگ جائے اور دوسرے وقت ہاتھ پر ہاتھ دھرے تماشائی بنارہے اور اسی طرح... اس سے ظاہر ہے کہ فطری انسان کو ہمیشہ ایک قسم کے ثابت اور یکساں قوانین اور قواعد وضوابط کی ضرورت ہے۔

اسلام نے بھی اپنی مقدس دعوت میں لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے اس کے علاوہ کچھ نہیں کہاہے۔ اسلام کہتاہے: انسان کی زندگی کوانسان کی خلقت کے عام اور خاص سسٹم سے قابل تطبیق کچھ قوانین اور قواعد وضوابط کے علاوہ کوئی اور چیز تحفظ نہیں بخش سکتی ہے۔

اور کہتاہے: ہمیں اپنی خدادادادراک اور ضمیر کے شعور کی طرف رجوع کرناچاہئے اور ہر قسم کی ہوس رانی اور بے راہ روی سے دوری اختیار کرنی چاہئے اور جس چیز کو حق تشخیص دے دیں اس کی پیروی کریں، ہمیں چند حقائق کی پیروی کرنے کو تقلید کانام نہیں دیناچاہئے اور ہمیں " قومی غرور" اور اپنے اسلاف کے "قدیمی رسومات" کی تقلید نہیں کرنی چاہئے ہمیں خداشناسی کو کہنہ پرستی کانام دے کر کچھ طاقتور ہوس رانوں کے پیروبن کران کے آلہ کار نہیں بنناچاہئے، جس کے نتیجہ میں ہر گوشہ وکنار میں سیکڑوں پتھر کے خدابناکران کی تعظیم کریں۔ بنیادی طور پر اسلام نے "اسلام" کے لفظ کااس لئے انتخاب کیاہے تاکہ اپنی دعوت میں اس نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرے کہ وہ صرف خدائے یکتااور خالق کائنات کی پرستش اور دوسرے الفاظ میں حق کی پیروی کی دعوت کرتے ہوئے اس کی طرف راہنمائی کرتاہے۔ اسلام نے اس نظریہ کی تفصیلی تشخیص کے مرحلہ میں اعتقادات، اخلاق اور قوانین کاایک سلسلہ عالم بشریت کے سامنے پیش کیاہے اور انھیں واجب الاطاعت حق کے طور پر معرفی کیاہے اور اس کانام ناقابل تغیر دین آسمانی رکھاہے۔

البتہ، ان تین مرحلوں۔ اعتقاد، اخلاق اور احکام۔ میں سے ہر ایک کے اجزا دوسرے اجزااور دوسرے مرحلوں کے ساتھ مکمل طور پر رابطہ رکھتے ہیں اور کائنات کی خلقت کے ساتھ بھی مکمل مطابقت رکھتے ہیں۔ اس مقالہ میں ان کے بارے میں تفصیلی بحث نہیں کی جاسکتی ہے، اس لئے ہم ان کی تفصیل کے پیش نظر ان کے بارے میں اجمالی بحث پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور ہمارا مقصد بھی اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اسلام میں موجود ناقابل تغیر قوانین کے ایک سلسلہ کوثابت کریں۔

متغیّر قوانین

جس طرح انسان کوثابت اور مستقل احکام وقوانین کے ایک سلسلہ۔ جوثابت اور یکساں فطری ضرورتوں کے تقاضوں کے مطابق وضع ہوں۔ کی ضرورت ہے، اسی طرح وہ قابل تغیر قوانین کے ایک سلسلہ کا بھی محتاج ہے اور انسانی معاشروں میں سے کوئی معاشرہ ہر گزاس قسم کے قوانین کے بغیر استحکام اور بقاء کی حالت حاصل نہیں کرسکتاہے، کیونکہ واضح ہے کہ اسی فطری انسان کی زندگی جواپنی خصوصی بناوٹ کے پیش نظر ثابت اور یکساں ہے، زمان ومکان کے تقاضوں کے مطابق مسلسل تغیر وارتقاسے بھی روبرو ہے اور انقلابی عوامل اور زمان ومکان کے گوناگوں شرائط سے بھی مکمل طور پر دوچار ہے اور اپنی صورت کوتدریجاًبدلتے ہوئے اسے نئے ماحول کے ساتھ مطابق بناتارہتاہے، ان حالات کابدلنا قوانین میں تغیر وتبدیل کاتقاضا کرتے ہیں۔

اسلام کے اس قسم کے قوانین واحکام میں ،ایک اصول ہے ،اس بحث میں ہم ''حاکم اختیارات'' کے طور پر وضاحت کریں گے۔یہ اسلام میں وہ اصول ہے ہر زمان و مکان میں لوگوں کے قابل تغیر ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور اسلام کے ثابت قوانین کو منسوخ اور باطل کئے بغیر انسانی معاشرہ کی ضرورتوں کا بھی جواب دہ ہے۔

مطالب کی وضاحت

اسلامی معاشرہ کا ایک فرد دینی قوانین کی رو سے حاصل کئے گئے اختیارات کے مطابق اپنی خصوصی زندگی کے محیط میں (تقویٰ کے سائے میں قانون کی رعایت کرتے ہوئے) ہر قسم کا اقدام کرسکتا ہے، جیسے ،اپنے مال سے مصلحت کے پیش نظر اور اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی کے حالات کو بہتر بناتے ہوئے بہترین خوراک ،لباس ،گھر اور سرمایہ سے استفادہ کرسکتا ہے ، یا ان میں سے بعض چیزوں سے صرف نظر کرسکتا ہے۔اور اسی طرح اپنے برحق حقوق کا ہر ظلم اور حملہ کے مقابلہ میں دفاع کرکے اپنی زندگی کے وجود کا تحفظ کرسکتا ہے ، یا وقت کی مصلحت کے پیش نظر دفاع سے پرہیز کرکے اپنے بعض حقوق سے چشم پوشی کرسکتا ہے۔اور اس کے علاوہ اپنے شخصی کسب و کار میں سرگرمی انجام دے سکتا ہے ، حتی رات دن کام کرسکتا ہے یا اپنی صواب دید کے مطابق کسی دن ایک کام کو تعطیل کرکے کسی دوسرے اہم کام کو انجام دے سکتا ہے۔

اسی طرح ولی امر مسلمین۔جو اسلامی نظریہ کے مطابق معیّن ہوچکا ہوگا۔اپنی حکمرانی کے علاقہ میں رکھنے والی عمومی ولایت کے مطابق ، حقیقت میں اسلامی معاشرہ کے افکار کا ہدایت کار اور عام لوگوں کے ارادہ و شعور کا مرکز ہوتا ہے ، جس تصرف کا حق ایک فرد کو اپنی زندگی کے محیط میں ہوتا ہے ، ولی امر کو بھی اسی تصرف کا حق معاشرہ کی عام زندگی میں ہوتا ہے۔

وہ تقویٰ کے سایہ میں ،اور دین کے ثابت احکام کی رعایت کرتے ہوئے مثال کے طور پر سڑکوں ، گزرگاہوں ، مکانات ، بازار ، کسب و کار اور لوگوں کے مختلف طبقات کے بارے میں ضروری قوانین وضع کرسکتا ہے ، وہ کسی دن دفاع کا حکم صادر کرکے فوج کو مسلح کرنے کے سلسلہ میں ہر قسم کے ضروری اقدامات کا فیصلہ کرکے بر وقت ان کو نافذ کرسکتا ہے ، یا کبھی مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر دفاع سے پرہیز کرکے مناسب معاہدے منعقد کرسکتا ہے
۔

وہ دین سے مربوط ثقافتی ترقی یا لوگوں کی خوشحال زندگی کے بارے میں فیصلہ کرکے وسیع پیمانہ پر کارروائی کرسکتا ہے یا کسی وقت معلومات کے چند سلسلوں کو منسوخ کرکے دوسری معلومات کو رائج کرسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ معاشرہ کی اجتماعی زندگی کی ترقی کے لئے ہر قسم کے مفید قوانین کو وضع کرنا۔جو اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت میں ہوں۔ولی امر مسلمین کے اختیارات سے مربوط ہیں اور ان کے وضع اور نفاذ کے بارے میں اس کے لئے کسی قسم کی ممنوعیت نہیں ہے۔البتہ اسلام میں اس قسم کے قوانین کا نفاذ اگرچہ لازم ہے اور ان قوانین کو نافذ کرنے کا پابند ''ولی امر مسلمین'' واجب الاطاعت ہے ، لیکن اس کے باوجود یہ قوانین شریعت اور حکم خدا شمار نہیں ہو تے۔اس قسم کے قوانین کا اعتبار قدرتی طور پر ایک ایسی مصلحتوں کے تابع ہوتا ہے ، جو اس کی متقاضی ہوتی ہیں اور اسے وجود میں لاتی ہیں اور مصلحت کے ختم ہونے کے ساتھ ہی یہ قانون ختم ہوتا ہے ،اس صورت میں گزشتہ ولی امر یا جدید ولی امر گزشتہ حکم کے ختم ہونے اور نئے حکم کے وجود میں آنے کا لوگوں میں اعلان کرتے ہوئے گزشتہ حکم کو منسوخ کرتا ہے۔

لیکن احکام الٰہی ، جو شریعت کے متن ہیں ہمیشہ کے لئے ثابت اور پائیدار ہیں اور کسی کو ، حتی ولی امر کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ ان میں وقت کی مصلحتوں کے

پیش نظر تبدیلی لاکر، ان کے ایک حصہ کے ختم ہونے کے پیش نظر انھیں منسوخ کرے۔

ایک غلطی کا ازالہ

اسلام کے ثابت اور متغیّر احکام اور قوانین کے بارے میں مذکورہ بیان سے، اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا بے بنیاد ہونا واضح اور ثابت ہو جاتا ہے۔ جو یہ کہتے ہیں: انسان کی اجتماعی زندگی کا دامن ایسا وسیع ہو چکا ہے کہ اس کا چودہ سو سال پہلی زندگی سے کسی قسم کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا ہے، جو قواعد وضوابط صرف آج کل کے نقل وحمل کے سسٹم کے لئے ضروری ہیں، قطعاً، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں لازم تمام قوانین اور قواعد و ضوابط سے وسیع تر ہیں اسی طرح آج کی انسانی زندگی کے تمام ابعاد میں اتنے بے شمار قواعد وضوابط موجود ہیں، جن کی گزشتہ زمانہ میں وضع اور نافذ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، چونکہ اسلام کے قوانین میں اس قسم کے احکام کا نام ونشان تک موجود نہیں ہے، اس لئے اسلام آج کل کی دنیا کے لئے کار آمد نہیں ہے

البتہ یہ حضرات اسلام کے مقدس دین کے بارے میں کافی معلومات نہیں رکھتے ہیں اور اس کے متغیّر قوانین سے بے خبر ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ یہ آسمانی دین چند ثابت اور یکساں احکام کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے متغیّر اور پیشرفت دنیا کا نظم ونسق چلانا چاہتا ہے یا خلقت کے اس غیر قابل مقابلہ سسٹم سے تلوار کے ذریعہ جنگ کر کے انسانی تمدن کی جبری ترقی کو روکنا چاہتا ہے... جہالت کی حد ہے! کچھ دوسرے لوگ اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں:

انسان کی اجتماعی زندگی میں جبری تبدیلی اور ارتقا، معاشرہ میں موجودہ ثابت قوانین میں تدریجی تغیر و تبدل کے متقاضی ہیں، اسی لئے اسلام کے ثابت قوانین کے صحیح اور سنجیدہ ہونے کی صورت میں یہ قوانین صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے شرائط اور عوامل کے مطابق قابل نفاذ ہوں گے، نہ ہمیشہ۔

ان حضرات نے قانونی مباحث میں بھی کافی توجہ نہیں کی ہے اور اس نکتہ سے غافل رہے ہیں کہ دنیا میں موجودہ تمام شہری قوانین میں کچھ ایسے دفعات موجود ہیں جو اجمالی طور پر قابل تغیر نہیں ہیں۔ اس میں شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ عصر جدید کے قوانین اور ضوابط قدیم زمانے کے قوانین کے ساتھ سو فیصدی اختلاف نہیں رکھتے اور آنے والے زمانوں کے قوانین سے بھی کلی طور پر اختلاف نہیں رکھیں گے، بلکہ ان میں کچھ مشترک ابعاد موجود ہیں جو کبھی پرانے اور نابود نہیں ہوتے۔ جیسا کہ گزشتہ بحث کے بعض حصوں میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اگرچہ اسلام، قوانین الٰہی کے وضع کرنے میں منبع وحی سے سرچشمہ حاصل کرتا ہے، اور اسی طرح متغیر قوانین کے وضع اور نفاذ میں ولی امر کے اختیارات سے سرچشمہ حاصل کرتا ہے۔ جو شوریٰ کے ذریعہ وضع ہو کر ولایت کے ذریعہ نافذ ہوتے ہیں۔ بہر حال اسلام کا یہ طریقہ کار عقل کی بناء پر استوار ہے نہ اکثریت کے جذباتی خواہشات پر، لیکن اس کے باوجود بھی اشتراکی اجتماعی حکومتوں سے عدم شباہت نہیں رکھتا، اسلام "آسمانی شریعت" کے نام پر کچھ ثابت احکام رکھتا ہے جن میں تبدیلی لانا اولیائے امور اور مسلمان کے بس میں نہیں ہے۔ یہ احکام ہمیشہ کے لئے تمام حالات اور شرائط میں واجب العمل ہیں۔ اس کے علاوہ اسلام میں کچھ قابل تغیر احکام بھی ہیں جو انسان کی اجتماعی زندگی کے تحول اور ارتقاء کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور معاشرہ کے تدریجی سعادت کے ضامن ہیں۔

اجتماعی حکومتوں میں بھی "آئین" کے نام سے ایک قانون موجود ہے جس میں تبدیلی ایجاد کرنا حکومتوں، پارلیمنٹ کے اراکین اور سینٹ کے اختیارات میں نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ان حکومتوں میں کچھ اور قوانین وضوابط ہوتے ہیں جو پارلیمنٹ یا کیبنٹ کے پاس کئے ہوئے قوانین ہوتے ہیں، یہ وہی قوانین ہیں جو ملک اور معاشرے میں تغیرات اور تحولات کے نتیجہ میں وضع ہوتے ہیں اور قابل تغیر ہیں۔ جس طرح ایک ملک کے "آئین" سے یہ

توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ مثلادارالخلافہ میں گاڑی چلانے اورٹریفک کے قوانین کی تفصیلات کو فوری طورپر بیان کرےاور ہر سال یاہر مہینے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے تقاضوں کے مطابق ان میں تبدیلی لائے،اسی طرح بنیادی احکام کے ضامن آسمانی شریعت سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی ہے کہ وہ ولایت کے قابل تغیر جزئیات کی حامل ہو(پہلے اعتراض کاجواب)اسی طرح کسی ملک کے آئین سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ تمام متغیّر دفعات کا حاصل ہو کر متغیّر بن جائے، حتیٰ ملک کی آزادی اوراس کے لئے صدارت کے عہدہ کی ضرورت جیسے مسائل بھی متزلزل اور ناپائدار ہوں۔اسی طرح شریعت۔جو آئین کے ناقابل تغیر احکام کے مانند ہے۔سے بھی متغیّر ہونے کی توقع نہیں رکھنی چاہئے(دوسرے اعتراض کاجواب(

لہذاپہلااعتراض(اسلام کا قانون ناقص ہےاوراس میں آج کے زمانہ کے مطابق قوانین کاایک سلسلہ موجود نہیں ہے) بےبنیاد ہےاوراسی طرح دوسرا اعتراض(اسلام کے احکام ثابت اور جامد ہیں جبکہ قوانین قابل تغیر ہونے چاہئے) بھی بےبنیاد ہے۔جی ہاں،اس باب میں دوسرے اعتراض سے متعلق ایک اور سوال پیدا ہوتاہےاور وہ یہ ہے :

یہ بات صحیح ہے کہ ترقی یافتہ معاشروں میں رائج قوانین میں ایسے دفعات بھی پائے جاتے ہیں جواجمالی طورپر قابل تغیر نہیں ہیں،لیکن کیاشریعت اسلام میں وضع ہوئے تمام قوانین اور ضوابط،جن سے اسلامی فقہ تشکیل پاتی ہے،ہمیشہ کے لئے انسانی معاشرہ کی سعادت کی ضمانت دے سکتے ہیں؟

کیاآج کے تمدن کا قافلہ، نماز،روزہ حج اور زکوۃ غیرہ کے ذریعہ اپنی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتاہے؟کیااسلام کے،غلامی،عورت،ازدواج،بیع،سود جیسے مسائل کے بارے میں وضع کئے گئے احکام آج کی دنیامیں اسی صورت میں باقی رہ سکتے ہیں؟

اس قسم کے مسائل طولانی ہیں جن کے بارے میں طویل بحث کی ضرورت ہے،اس لئے ان کے بارے میں مناسب جگہ پر بحث و تحقیق کی جانی چاہئے۔

خاتمیت کا مسئلہ

کیاانسان عصر جدید میں وحی کا محتاج ہے؟

سوال: اگر کوئی شخص اس سوال کے جواب میں کہے کہ ہر مخلوق کے لئے ارتقاء ضروری ہے، پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیوں یہ فرمایا :''میں آخری پیغمبر ہوں؟'' یہ کہہ کر گویا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''خاتم انبیاء میں ہوں''، آپ یہ کہنا نہیں چاہتے ہیں: جو کچھ میں نے کہا ہے وہ انسان کے لئے ابدی طور پر کافی ہے، بلکہ خاتمیت یہ کہنا چاہتی ہے کہ انسان اب تک اس کا محتاج تھا کہ اس کی زندگی کے لئے ماورائے عقل وتربیت بشری راہنمائی کی جائے، اب اس زمانہ (ساتویں صدی عیسوی) میں، یونانی، رومی اور اسلامی تمدن اور قرآن، انجیل وتوریت کے آنے کے بعد انسان کی مذہبی تربیت ضرورت کی حدتک انجام پائی ہے اور اس کے بعد انسان اس طرز تربیت کی بنیاد پر وحی اور نئی نبوت کے بغیر اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر اپنی زندگی کو جاری رکھتے ہوئے اسے پائے تکمیل تک پہنچا سکتا ہے، اس لئے اب نبوت ختم ہوئی ہے! انسان راستہ کو خود طے کر سکتا ہے۔ پیغمبرؐ اسلام فرماتے ہیں: اس کے بعد تم لوگ تربیت یافتہ ہو اور تم لوگوں کا شعور مصلحت، سعادت، ارتقاءاور آرام وآسائش کو برقرار کرنے کی حدتک پہنچ گیا ہے، تم میں توانائی ہے اور سمجھتے ہو یعنی تمہارا شعور اور تفکر، ارتقاء کے ایک ایسے مرحلہ تک پہنچ گیا ہے کہ اب تمہیں وحی کی دستگیری کی ضرورت نہیں ہے جو تمھیں قدم قدم پر راہنمائی کرے، اس کے بعد عقل وحی کی جانشین ہو گی...!

کیااس قسم کی تعبیر، ''خاتمیت'' کے منافی ہے یا نہیں؟

جواب: مذکورہ استدلال کا خلاصہ یہ ہے: انسان دوسری مخلوقات کے مانند ارتقاء کی گزر گاہ پر قرار پایا ہے، اس راہ سے انسانی معاشرہ زمانہ اور وقت کے گزر نے کے ساتھ ساتھ اپنی خلقت میں خاص حالات پیدا کر کے نئے شرائط میں قرار پاتا ہے، جس کے لئے مزید اور تازہ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اس بنا پر انسان اپنی زندگی کی روش کے مراحل میں سے ہر مرحلہ پر، دوسرے الفاظ میں اس مرحلہ سے مربوط ضرورتوں کے مطابق تازہ اور مناسب دینی احکام اور قوانین کا محتاج ہوتا ہے، اس لئے وہ ہر گز دین یا زندگی کی ایک روش کو ابدی اور ہمیشہ کے لئے فرض نہیں کر سکتا ہے۔ من جملہ شریعت مقدس اسلام بھی ایک واقعی دین اور بشر کا حقیقی راہنما ہے، یہ ابدی دین نہیں ہو سکتا ہے! اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاتم النّبیّین ہونے کا مطلب، کہ آپؐ فرماتے ہیں: ''میں خاتم النبیین ہوں'' یہ ہے کہ عقل کی کمزوری کی وجہ سے اب تک انسان اپنی زندگی کے لئے تعقل اور بشریٰ تربیت سے ماورا راہنمائی کا محتاج تھا، لیکن اس زمانہ (ساتویں صدی ہجری) میں یونانی، رومی اور اسلامی تمدن کے آنے اور آسمانی کتابوں جیسے توریت، انجیل اور قرآن مجید کے نزول کے بعد انسان کی مافوق بشری تربیت ضرورت کی حدتک پوری ہو چکی ہے، اب وہ وحی کی راہنمائی کا محتاج نہیں ہے خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی طاقت رکھتا ہے، اس لئے نبوت اور وحی کا خاتمہ ہوا ہے، انسان کو اب اپنی عقل سے زندگی کو جاری رکھنا چاہئے اور وہ اس کے بعد وحی ونبوت سے بے نیاز ہے۔ یہ استدلال کا خلاصہ ہے، لیکن قابل ذکر بات ہے کہ یہ بیان مختلف جہات سے مخدوش ہے :

پہلا اعتراض: اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ انسان (فرد ہو یا اجتماع) ارتقاء کی گزر گاہ پر قرار پایا ہے، اسی طرح اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ انسان ایک محدود حقیقت ہے اور اس کا ارتقاء بھی کیفیت اور کمیّت کے لحاظ سے محدود ہے نہ لا محدود اور اس کا ارتقاء جس قدر وسیع تر فرض کیا جائے

بالآخر ایک مرحلہ پر رک جائے گا اور نتیجہ کے طور پر اس وقت عالم بشریت پر حکومت کرنے والی روش اور قوانین ثابت اور غیر متغیر ّہوں گے، لہذا انسان کے ارتقاء کی گزر گاہ پر ہونا بذات خود ایک ثابت اور ابدی دین کے تحقق کی دلیل ہے نہ اس کی نفی۔

دوسرا اعتراض: یونانی اور رومی تمدن۔ جو بت پرستی اور اس کے وضع کردہ قوانین کی پیداوار تھے۔ کو انسانی عقل کے ماوریٰ سمجھنا قرآن مجید کے واضح نص کے خلاف ہے کہ بہت سی آیتوں میں ان کے رسم ورسوم کو گمراہی اور ہلاکت کی راہ شمار کیا گیا ہے اور ان کے اعمال کو۔ اگرچہ نیک اعمال کی صورت میں بھی ہوں۔ برباد، باطل اور مکمل طور پر بے اثر اور بے اعتبار شمار کرتا ہے اور جو راستہ گمراہ، بے اثر اور بے اعتبار ہو، ہر گز راہنمائی کرنے والا اور سعادت تک پہنچانے والا راستہ نہیں ہوگا (اس سلسلہ میں آیات اس حد تک زیادہ ہیں کہ ان کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے(

تیسرا اعتراض: اس بات کا اعلان کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے زمانہ، یعنی ساتویں صدی عیسوی کے بعد لوگوں کی عقلیں چونکہ مکمل ہوئی ہیں اور شریعت آسمانی کی اب ضرودرت نہیں ہے اور انسان وحی کی راہنمائی سے بے نیاز ہے، کیا یہ نظریہ نئی آسمانی شریعت کے لانے اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دینے کے ساتھ واضح تضاد نہیں رکھتا؟ اور وہ بھی ایک ایسی شریعت کے بارے میں جو قرآن مجید کی نص کے مطابق تمام گزشتہ شریعتوں کی جامع ہے، چنانچہ فرماتا ہے :

)شرع لکم من الدّین ماوصّی بہ نوحاً والذي اوحینا الیک وماوصّینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ...)(شوریٰ،۱۳(

"اس نے تمہارے لئے دین میں وہ راستہ مقرر کیا ہے جس کی نصیحت نوح کو کی ہے اور جس کی وحی پیغمبر! تمہاری طرف بھی کی ہے اور جس کی نصیحت ابراھیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی کی ہے"...

ایک ایسا دین، جیسے خداوند متعال نے اپنے کلام میں واضح طور پر اسلام کہا ہے اور اس کی شریعت ابراھیم علیہ السلام کے طور پر تفسیر کی ہے اور فرمایا: لوگوں سے اس کے علاوہ کسی اور چیز کو قبول نہیں کرتا اور کسی کو اس کی مخالفت کرنے کا حق نہیں ہے:

)إنّ الدّین عنداللہ الاسلام...)(آل عمران،۱۹(

"دین، اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے"

)ومَن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یُقبلَ منہ (...

)آل عمران،۸۵(

"اور جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کرے گا تو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا"...

)ملّۃ ابیکم ابراھیم ھو سمّٰیکم المسلمین...)(حج،۷۸(

"یہی تمہارے بابا ابراھیم کا دین ہے اس نے تمہارا نام پہلے بھی اور اس قرآن میں بھی مسلم اور اطاعت گزار رکھا ہے"

)وماکان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضیٰ اللہ ورسولہ أمراً أن یکون لھم الخیرۃ من أمرھم...)(احزاب،۳۶(

"اور کسی مومن مرد یا مومنہ عورت کو اختیار نہیں ہے کہ جب خدا اور رسول کسی امر کے بارے میں فیصلہ کریں تو وہ بھی اپنے امر کے بارے میں صاحب اختیار بن جائے"...

یا ہم یہ کہیں کہ تمام آسمانی تکالیف خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت سے متعلق تھیں اور دوسرے لوگ وحی اور آسمانی احکام کے بارے

میں آزاد تھے،اس صورت میں قرآن مجید کے یہ سب خطاب: (یا أیھاالناس) (یا أیھاالذین آمنوا) وغیرہ کا معنی کیا ہے؟وحی کے پیروکاروں کو یہ سب بشارتیں کیا معنی رکھتی ہیں؟اور مخالفت کرنے والوں کو یہ سب انتباہ کس لئے؟ یاہم یہ کہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی طرف آپؐ کی دعوت،دین اسلام کو پہنچانے کے بعد خود بخود تجویزی صورت اختیار کر گئی،اس طرح(ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین....) (احزاب،۴۰) کا لازمی معنی یہ ہے کہ تم انسان اس تاریخ کے بعد ہدایت،وحی اور آسمانی شریعت سے آزاد ہو اور اب تم اپنی۔کامل ہوئی۔عقلوں کے مطابق اپنی زندگی کی راہ وروش کو تشخیص دے کر قدم بڑھاؤ اور میں قوانین کے ان دفعات کو مرتب کر کے تمہارے لئے لایا ہوں،تمہیں تجویز کرتا ہوں کہ انھیں اپنی عقل سے موازنہ کرو،اگر عقل نے ان کی تصدیق کی تو انھیں قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا۔حقیقت میں یہی جمہوریت کے تمدن کا معنی ہے ،جس کے مطابق اس تمدن میں اجتماعی قوانین لوگوں کی اکثریت کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں،لیکن دیکھنا چاہئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز،روزہ،زکواۃ وحج وجہاد وغیرہ جیسے ان احکام اور قوانین میں سے کس قانون کو نزول کے بعد شوریٰ میں قرار دیا ہے اور اکثریت کی رائے اور مرضی حاصل کرنے کے بعد اسے نافذ کیا ہے؟ یہ ایک ایسا مطلب ہے جس کا تاریخ اور سیرت میں ایک نمونہ تک پیدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔

جی ہاں،بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک اصلی حکم کو عملی جامہ پہنانے کی کیفیت اور حکم الٰہی کی اطاعت کے لئے اجتماعی کاموں کے بارے میں صلاح ومشورہ فرماتے تھے،جیسا کہ ''جنگ احد''میں شہر کے اندر دفاع کیا جائے یا شہر کے باہر جیسے مسائل میں صلاح ومشورہ فرمایا۔البتہ اصلی حکم پر عمل کرنے اور حکم کے طریقہ کار پر عمل کرنے میں فرق ہے۔

یاہم یہ کہیں کہ اس آیہ کریمہ:(...ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین...)(احزاب،۴۰)کا معنی یہ ہے کہ اس کے پیش نظر کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسول ہیںؐ جو دین لائے وہ سنجیدہ اور متین دین ہے،لیکن چونکہ نبوت آپؐ کے ساتھ ختم ہو گئی،اگر اس زمانہ کے بعد دینی احکام میں سے کوئی حکم وقت کی مصلحت کے مطابق نہ ہو بلکہ مخالف ہو تو اسے عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد بدل کر مصلحت کے مطابق اس کی جگہ پر ایک نیا حکم جانشین کرنا چاہئے۔

اس بحث کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شریعت اسلام بھی زمانوں کے اختلاف اور تقاضوں میں تبدیلی کے پیش نظر دوسرے اجتماعی قوانین کی طرح متغیّر ہے ۔صدر اسلام کے خلفاء نے بھی اسی ذوق کے پیش نظر اسلامی احکام کے بعض حصوں۔جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں نافذ تھے۔پر پابندی لگادی یا ان میں تبدیلی لائی۔اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت بیان کرنے والی احادیث کو نقل کرنے اور ان کی نسخہ برداری کو،قرآن مجید کی حرمت کے تحفظ کے نام پر،پہلی صدی ہجری میں شدیداً ممنوع قرار دیا گیا اور صرف قرآن مجید کی نسخہ برداری کی اجازت تھی۔

یہ طریقہ کار،یعنی زمانوں کے بدلنے کے ساتھ دینی احکام اور قوانین کا بدلنا۔۔اگرچہ بعض دانشوروں خاص کر اہل سنت والجماعت کے مصنفوں کے رجحان کا سبب بنا،لیکن یہ طریقہ کار واضح طور پر قرآن مجید کے منافی ہے اور اسلام کا مقدس دین اس قسم کی تبدیلی کو ہر گز قبول نہیں کرتا ہے۔قرآن مجید اپنے بیانات میں اس بات پر تاکید فرماتا ہے اور انسان کی بے داغ فطرت اور ضمیر کا بھی یہی حکم ہے،کہ حق کی اطاعت وپیروی کی جانی چاہئے اور حق کی مخالفت گمراہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

...)فماذا بعد الحق الا الضلٰل...)(یونس،۳۲(

...''اور حق کے بعد ضلالت کے سوا کچھ نہیں ہے''...

قرآن مجید حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور باطل کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں ہے اور نہیں ہوگی:

...)وانہ لکتاب عزیز*لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید)(فصلت،۴۱۔۴۲(

...''بیشک یہ ایک عالی مرتبہ کتاب ہے۔ جس کے قریب، سامنے یا پیچھے کسی طرف سے باطل آ بھی نہیں سکتا ہے کہ یہ خدائے حکیم وحمید کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔''

قرآن مجید ناقابل بطلان اور منسوخ کتاب ہے، اس کے بعض مطالب میں تبدیلی پیدا ہونا بے معنیٰ ہے۔

بلکہ قرآن مجید واضح الفاظ میں شریعت کے حکم اور تشریع کو خدائے متعال کا خصوصی امر جانتا ہے اور حکم جاری کرنے میں کسی کو خدا کا شریک نہیں ٹھہراتا ،جیسا کہ فرماتا ہے:

...)إن الحکم إلّا للہ أمرَ ألّا تعبدوا ألّا ایّاہ...)(یوسف،۴۰(

...''حکم کرنے کا حق صرف خدا کو ہے اور اسی نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کی جائے''...

مزید فرماتا ہے:

)وما اختلفتم فیہ من شيءٍ فحکمہ الی اللہ..)(شوریٰ،۱۰(

''اور تم جس چیز میں بھی اختلاف کروگے اس کا فیصلہ اللہ کے ہاتھوں میں ہے''..

جب خدائے متعال کے علاوہ کسی کو حکم جاری کرنے کا حق نہیں ہے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنی عقل پر بھروسہ کر کے حکم جاری کرے اور آسمانی حکم سے بے نیاز ہو؟

جی ہاں، اسلام میں کچھ ایسے قوانین اور ضوابط ضروری ہیں جو قابل تنسیخ وتغیر ہیں اور وہ ایسے قوانین ہیں جنھیں ولی امر (اسلامی حکومت) مختلف حالات میں وقت کی مصلحتوں کے پیش نظر شرع کے سایہ میں وضع کرتا ہے۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ ولی امر کی معاشرہ سے نسبت ایک چھوٹے گھرانے سے اس کے مالک اور سربراہ کی نسبت کے مانند ہے۔ گھر کا مالک مصلحت کے پیش نظر اپنے گھر میں ہر قسم کا اقدام کر سکتا ہے اور گھر کے افراد کو ان کی مصلحتوں کے مطابق ان کے نفع میں ہر قسم کا حکم جاری کر سکتا ہے اور اگر ان کے گھریلو حقوق پر ظلم وستم ہو جائے تو دفاع کر سکتا ہے، یا اگر مصلحت نہ سمجھے تو خاموش بیٹھ سکتا ہے! لیکن وہ جس قسم کے بھی اقدام کرے یا کوئی قانون جاری کرے تو وہ دین کے مطابق ہونا چاہئے، وہ کسی ایسے اقدام یا حکم کو انجام نہیں دے سکتا جو دین کے مخالف ہو۔ ولی امر بھی، مصلحت کے تقاضوں کے مطابق، اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے دفاع اور جہاد کا حکم دے سکتا ہے یا کسی حکومت کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر سکتا ہے یا جنگ یا صلح کی ضرورتوں کے مطابق نئے ٹیکس لگا سکتا ہے اور اسی طرح... یہ قوانین دین اور وقت کی مصلحتوں کے مطابق ہونے چاہئے اور ضرورت پوری ہوتے ہی یہ قوانین خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

نتیجہ کے طور پر، اسلام کے پاس دو قسم کے قوانین ہیں: ثابت اور غیر متغیّر قوانین اور یہ آسمان شریعت ہے، جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

)ولقد آتینا بنی اسرائیل الکتاب والحکم والنبوۃ... *ثم جعلنک علی شریعۃ من الامر فاتبعھا ولا تتّبع اھواء الذین لا یعلمون * انّھم لن یغنوا عنک من اللہ شیا وانّ الظٰلمین بعضھم اولیاء بعض واللہ ولیّ المتّقین)(جاثیہ،۱۶۔۱۹(

''اور یقیناًہم نے بنی اسرائیل کو کتاب، حکومت اور نبوت عطا کی ہے... پھر ہم نے آپ کو اپنے حکم کے واضح راستہ پر لگادیا لہذا آپ اسی کا اتباع کریں اور خبر دار جاہلوں کی خواہشات کا اتباع نہ کریں۔ یہ لوگ خدا کے مقابلہ میں ذرہ برابر کام آنے والے نہیں ہیں اور ظالمین آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں تو اللہ صاحبان تقویٰ کا سرپرست ہے''

اس قسم کے قوانین کو شریعت کہا جاتا ہے۔ اور قابل تغیر قوانین، جنھیں اقتضائے مصلحت وزمان کے مطابق ولی امر وضع کر کے نافذ کرتا ہے، ضرورت پوری ہونے پر خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

دوسرا حصہ:

علمی، فلسفی مسائل

حدوث عالم پر برہان

سوال: امام علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ آپ کے پاس حدوث عالم کے بارے میں کونسی دلیل ہے ؟

امام فرماتے ہیں: انڈے پر توجہ کیجئے کہ دو مختلف رقیق چیزوں سے بنا ہے اور اس سے نر و مادہ کی صورت میں مختلف چوزے پیدا ہوتے ہیں اور حدوث عالم پر یہی دلیل ہے۔ سائل خاموش ہوتا ہے۔ امامؑ کا یہ بیان حدوث عالم پر کونسی دلیل رکھتا ہے ؟ ا۔

جواب: انڈا دو مختلف رقیق چیزوں کا مرکب ہے اور اس سے نر و مادہ اور مختلف چوزوں کی پیدائش کائنات کے حادث، یعنی مخلوق ہونے اور اس کے کسی مافوق علت کی طرف مستند ہونے پر دلیل ہے کیونکہ ان مختلف (چیزوں کی) صورتوں اور شکلوں میں گوناگوں آثار کے ظاہر ہونے کو وہم و گمان اور جھوٹا فرض کر کے غلط نہیں بتایا جا سکتا ہے یا کہا جائے یہ سب سفسطہ ہے بلکہ یہ ایک ایسی حقیقتیں ہیں جو ہر ایک اپنے طور پر مختلف انفرادیتوں، آثار اور خصوصیتوں پر مشتمل ہیں اور ان کے درمیان موجود جو انتہائی منظم رابطہ

۱۔ تفسیر ابوالفتوح رازی ج۲، ص۳۰۱

اور حیرت انگیز نظام کے پیش نظران کی پیدائش کواتفاقی حادثہ اور بدون سبب وعلّت فرض نہیں کیا جاسکتا ہے، بلکہ یہ ایسی حقیقتیں ہیں جو سبب کے موجود ہونے کے لئے استناد رکھتی ہیں اور ان میں اختلاف کے حقیقی ہونے کے سبب انھیں کسی یکساں اور کسی قسم کا اختلاف نہ رکھنے والے مادّہ کا معلول نہیں جاننا چاہئے۔ اور اگر مادہ میں اختلاف ترکیب یااختلاف حرکت فرض کریں، تواب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اختلاف ترکیب یااختلاف حرکت کہاں سے پیدا ہوئی ہیں؟

لہذاناچار، ان شکل وصورتوں اور آثار کے ذاتی اختلاف کو مادہ اور مادی دنیا سے بلند ترعلّت وسبب سے نسبت دینی چاہئے اور نتیجہ کے طورپر انڈے کو اور اس پر مرتب ہونے والے تمام آثار اور اس کی مختلف ترکیبوں کو حادث اور کسی دوسری علّت کا نتیجہ جاننا چاہئے۔ اور یہی خصوصیت جو ہم انڈے میں پاتے ہیں کائنات کی دوسری تمام مخلوقات میں پائی جاتی ہے اور حتی کہ ،مادّہ جو وجود میں آنے کے لئے شکل وصورت کا محتاج ہے اور نتیجۂ وسیع ترنظام کے ساتھ حادث ہے اور علت کی محتاج ہے۔

دوسرے انبیاء علیہم السلام پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت

سوال: کیاقرآن مجید میں آیہ خاتم کے علاوہ کوئی دوسری آیت موجود ہے جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت اور دوسرے پیغمبروں پر آپ کی فضیلت ثابت ہوتی ہو؟

جواب: جس طرح آیہ شریفہ:

...)ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین...)(احزاب،۴۰(

خاتمیت پر دلالت کرتی ہے، اسی طرح کچھ آیتیں دین اسلام کے عام اور ابدی ہونے پر دلالت کرتی ہیں، جیسے:

...)واُوحی الیّ ھذاالقرآن لأنذرکم بہ ومن بلغ...) (انعام،۱۹(

''اور میری طرف اس قرآن کی وحی کی گئی ہے تاکہ اس کے ذریعہ میں تمھیں اور جس شخص تک یہ پیغام پہنچے سب کوڈراؤں''...

اور آیہ شریفہ:

...)وانہ لکتاب عزیزلایأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ)(فصلّت،۴۱۔۴۲(

...''اور یہ ایک عالی مرتبہ کتاب ہے، جس کے قریب، سامنے یاپیچھے کسی طرف سے باطل آنہیں سکتا ہے۔''

کیونکہ کسی دین کی عمر اور دوام، مذکورہ دین کولانے والے کی خاتمیت کے بغیر قابل تصور نہیں ہے۔

اسی طرح جو آیتیں دوسری آسمانی کتابوں کی نسبت قرآن مجید کی افضیلت کی دلالت پیش کرتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

...)ونزّلناعلیک الکتب تبیاناًلکل شيء...)(نحل،۸۹(

...''اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جس میں ہر شے کی وضاحت موجود ہے''...

اور آیہ شریفہ:

)وأنزلناالیک الکتاب بالحق مصدقاًلمابین یدیہ من الکتاب ومھیمناًعلیہ...)(مائدہ،۴۸(

''اوراے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی ہے جو اپنے پہلے کی توریت اور انجیل کی مصدق اور محافظ ہے لہذا آپ ان کے درمیان تنزیل خدا کے مطابق فیصلہ کریں''...

اور آیہ شریفہ:

)شرع لکم من الدّین ماوصّی بہ نوحاًوالذی اوحینا الیک وماوصّینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ...)(شوریٰ،۱۳(

''اس نے تمہارے لئے دین میں وہ راستہ مقرر کیا ہے جس کی نصیحت نوح کو کی ہے اور جس کی وحی پیغمبر! تمہاری طرف بھی کی ہے اور جس کی نصیحت ابراھیم، موسی اور عیسی کو بھی کی ہے''...

مذکورہ آیتیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افضیلت پر بھی دلالت کرتی ہیں، کیونکہ قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا حصہ ہونے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدر ومنزلت کا توازن آپؐ کی دعوت کی قدر وقیمت ہے۔

اہل توحید کی شفاعت

سوال: علاّمہ مجلسی کی کتاب ''توحید''میں، موحدین کے حالات کے ضمن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے: (وان اھل التوحید لیشفعون فیشفعون)(زخرف،۸۶(

بیان فرمایئے کہ اہل توحید کن لوگوں کی شفاعت کرتے ہیں، غیر موحدین کی شفاعت کرنا تو ممکن نہیں ہے اور خود موحدین کی شفاعت کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ موحدین خود شفاعت کرنے والے ہیں، پس یہ کن کی شفاعت کرتے ہیں؟

جواب روایت (وان اھل التوحید لیشفعون فیشفعون) ۱۔

کے مندرجہ ذیل دومعنی میں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے:

یااہل توحید سے مقصود موحدّین میں سے سب سے کامل اور سب سے بڑے علماء ہیں، اس کی دلالت مندرجہ ذیل دو آیات کریمہ پیش کرتی ہیں:

)ولایملک الذین یدعون من دونہ الشفاعۃ الاّ من شھد بالحق وھم یعلمون)(زخرف،۸۶(

''اوراس کے علاوہ جنھیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سفارش کا بھی اختیار نہیں رکھتے ہیں مگر وہ جو سمجھ بوجھ کر حق کی گواہی دینے والے ہیں۔''

اور آیہ شریفہ:

...)إلاّ من أذن لہ الرّحمٰن وقال صوابا)(نباء،۳۸(

...''علاوہ اس کے جسے رحمان اجازت دیدے اور ٹھیک بات کرے۔''

یااس کا معنی یہ ہے کہ، موحدین، مستضف لوگوں کی شفاعت کرین گے، موحدین، جن کے حق میں خدائے متعال فرماتا ہے:

)وآخرون مرجون لأمر اللہ امّا یعذّبھم وامّا یتوب علیھم (

۱۔ صدوق، توحید: ۲۹، ح ۳۱ (توبہ،۱۰۶(

''اور کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں حکم خدا کی امید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ یا خدا ان پر عذاب کرے گا یا ان کی توبہ کو قبول کرلے گا''...

اور بظاہر و کمزور طبقہ لوگوں کی اکثریت کو تشکیل دیتا ہے۔

اسلام میں غلامی کی توجیہ

سوال: گزشتہ سوالات میں اسلام میں غلامی و بندگی کے جاری رہنے کے بارے میں سوال ہوا تھا جس کا آپ نے مختصر اور اجمالی جواب دے دیا اور مکمل جواب کے لئے تفسیر المیزان کی چھٹی جلد کی طرف رجوع کرنے کو فرمایا تھا، جبکہ تفسیر المیزان میں حقیر کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا ہے۔

میں نے سوال کیا ہے کہ اگر اسلام کے اوائل میں کچھ مصلحتوں کی بنا پر غلامی کو جائز قرار دیا گیا ہے، لیکن یہ جانتے ہوئے کہ انسان کی فکر ترقی اور ارتقاء کی طرف بڑھ رہی ہے اور ایک دن ایسا آئے گا جب بشریت غلامی کو قبیح سمجھ لے گی اور عقل کی رو سے بھی قابل قبول نہیں ہے کہ کچھ لوگ کچھ دوسرے لوگوں کو اپنا استعمار بنا کر ان کی ہر قسم کی آزادی کو چھین لیں اور بعض عبادی مسائل یا دوسرے جوانب سے کیوں غلام کو پست اور حقیر قرار دیا گیا ہے؟ اسی طرح اگر کفار کو اس لئے غلام بناتے تھے تا کہ اسلام کے ماحول میں تربیت حاصل کریں، تو ان کی اولاد کیوں ان کے والدین کی تبعیت میں غلام بن گئیں ، اگرچہ وہ مسلمان بھی ہوتے؟

اگر آپ فرمائیں گے کہ اسلام نے ان کی آزادی کے لئے بہت سے راستے بتائے ہیں، تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ موضوع غلامی کے اصل جواز کے بارے میں اعتراض کو دور نہیں کرتا؟

جواب: آپ نے لکھا ہے کہ اسلام میں غلامی کے اعتراض کے جواب کے بارے میں المیزان کی چھٹی جلد کی طرف رجوع کرنے کو کہا تھا جبکہ مذکورہ تفسیر میں اس اعتراض کا جواب نہیں دیا گیا ہے، مختصر یہ کہ انسان کو مکمل ہونے والی عقل کسی کو غلام بنانے اور اس کی مطلق آزادی کو سلب کرنے کو قبیح جانتی ہے اور عقل کی رو سے بھی یہ قابل قبول نہیں ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کفار کو اس لئے غلام بناتا تھا تا کہ اسلام کے ماحول میں ان کی تربیت کی جائے تو ہم یہ کہیں گے: ان کی اولاد کا کیا قصور اور گناہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی غلامی کی حالت میں باقی رہیں؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ اسلام نے ان کی آزادی کے لئے ایک طریقہ کار معین کیا ہے تو ہم کہیں گے: اعتراض اس کے غلام بننے کے بعد اس کی اصلی غلامی کے جاری رہنے میں ہے...

لگتا ہے کہ تفسیر میں درج کی گئی بحث پر مکمل توجہ نہیں کی گئی ہے، لہذا ناچار ہم پھر سے اس کی وضاحت کرتے ہیں:

سب سے پہلے اصولاً جاننا چاہئے کہ: اگرچہ انسان اختیار کی صفت کے مطابق آزاد خلق کیا گیا ہے، لیکن اس کے لئے مطلق آزادی کا ہرگز تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جو انسان فطری طور پر سماج میں، معاشرہ کے تحفظ کے قوانین و ضوابط کی قہراً رعایت کرتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہو، وہ مطلق العنان اور ہر خواہش کے سلسلہ میں سرگرم عمل نہیں ہو سکتا ہے۔ لہذا انسان کی آزادی بہر حال قوانین اور ضوابط کے دائرہ میں محدود ہوتی ہے

دوسرے الفاظ میں انسان فی الجملہ آزاد ہے نہ بالجملہ یعنی مکمل طور پر آزاد نہیں ہے۔ معاشرہ کے عام اور متوسط افراد بعض مواقع اور قوانین کے مطابق ہر قسم کا کام انجام دینے کی آزادی نہیں رکھتے ہیں اور کچھ افراد کی آزادی بعض شرائط کے تحت سلب کی جاتی ہے۔

دیوانہ، بیوقوف اور بچوں کو ہر کام انجام دینے کی آزادی نہیں دی جا سکتی ہے، جانی دشمن اور لاابالی مجرم کو ہر قسم کی آزادی نہیں دی جا سکتی ہے۔

دوسرے یہ: حقیقت میں غلامی، بندگی اور ان کے مانند مسائل پر جھگڑا نہیں ہے بلکہ ان کے معنی میں نزاع ہے، خواہ ان کے ساتھ غلامی کا نام ہو یا نہ ہو۔ غلامی کی حقیقت کا مطلب ارادہ و عمل کی آزادی کا سلب کرنا ہے اور واضح ہے کہ جسے ارادہ و عمل میں آزادی نہ ہو، اس کا ارادہ و عمل کسی دوسرے کے اختیار میں ہوگا، اسی لئے غلاموں کو خرید و فروخت کیا جاتا تھا۔

گزشتہ اقوام میں غلامی مندرجہ ذیل چار صورتوں میں رائج تھی:

۱۔ خاندان کا سرپرست اپنے ماتحت لڑکی اور لڑکے کو بیچ سکتا تھا۔

۲۔ مرد، کبھی اپنی بیوی کو بیچتا تھا، اور کبھی کرایہ یا ادھار دیتا تھا یا اسے کسی کو بخش دیتا تھا۔

۳۔ ایک قبیلہ کا سردار، اپنی قدرت کے بل بوتے اور استناد پر جسے بھی چاہتا اسے اپنا غلام و بندہ بنا سکتا تھا، چنانچہ پادشاہوں کو "مالک الرقاب" (غلاموں کے مالک) کہا جاتا تھا۔

۴۔ دو متخاصم گروہوں میں سے جنگ میں فتح حاصل کرنے والا گروہ اگر اپنے جانی دشمن کو زندہ پکڑتا تھا، وہ اسے اپنا غلام بنا سکتا تھا اور اسے مار سکتا تھا یا بیچ سکتا تھا۔

اسلام نے غلام کی مذکورہ چار قسموں میں سے پہلے تین قسموں کو منسوخ کر دیا ہے اور اولاد کی نسبت والدین کے حقوق کو محدود کر کے اور اسی طرح شوہر کے حقوق کو بیوی کی نسبت محدود کر کے یا عادل اسلامی حکومت کی طاقت سے اس قسم کی غلامی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے، لیکن غلامی کی چوتھی قسم کی تصدیق کی ہے اور اس کی تائید نہ کرنا ممکن نہیں تھا، کیونکہ اسلام ایک فطری دین ہے اور یہ عین فطرت کے حکم کے مطابق ہے۔ کسی ایسے فرد یا معاشرہ کو نہیں پایا جا سکتا ہے، جو اس کی ہستی اور وجود یا اس کے مقدسات کو نیست و نابود کرنے والے دشمن کے مقابلہ میں خاموش تماشائی بن کر بیٹھے اور اپنی ہستی کا دفاع نہ کرے جو اس کے دشمن کی نابودی پر منحصر ہے یا دشمن پر فتح پانے کے بعد صرف اسی فتحیابی کے نام پر اکتفا کر کے اپنے دشمن کو دوبارہ اس کے ارادہ و عمل پر آزاد رکھے اور اس کے ارادہ و عمل کو سلب نہ کرے (جو وہی غلامی ہے)، مگر یہ کہ عفو و بخشش کے لئے کچھ تقاضے اور عوامل پیدا ہوں، جہاں تک انسان ہے اور ہو گا اس کی خداداد فطرت یہی حکم کرے گی۔

لیکن جو آپ نے لکھا ہے کہ عقل کے مطابق یہ قابل قبول نہیں ہے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کو استعمار کر کے اس کی ہر قسم کی آزادی کو سلب کرے۔ یہ بیان صرف غلامی کی پہلی تین قسموں پر لاگو ہے اور مذکورہ وضاحت کے پیش نظر چوتھی قسم پر لاگو نہیں ہو سکتا ہے۔

لیکن جو آپ نے لکھا ہے کہ آج کی ترقی یافتہ فکر، غلامی کو قبیح جانتی ہے، اس بیان کا معنی (اگرچہ جناب عالی نے ارادہ بھی نہ کیا ہو گا) یہ ہے کہ متمدن دنیا یعنی مغربی دنیا سلب آزادی کو قبیح جانتی ہے، چنانچہ تقریباً اسی سال پہلے بڑی کوششوں اور جدوجہد کے بعد انہوں نے عام غلامی کو منسوخ کرنے کا اعلان کیا ہے اور اس طرح ان کے بقول: عالم بشریت کو ایک ننگ سے نجات دے کر دنیا کے لوگوں، حتی مسلمانوں پر۔ جن کا دین اس کی اجازت دیتا تھا ۔ منت رکھی ہے، لیکن دقّت اور صحیح طور پر توجہ کرنی چاہئے کہ ان انسان دوست مترقی حکومتوں نے غلامی کو منسوخ کرنے کے اس قانون کو کس قدر نافذ کیا ہے؟!

جی ہاں! انہوں نے غلامی کی پہلی قسم (فرزند فروشی اور عورت فروشی) کو منسوخ کیا ہے، جو افریقہ اور اس کے بعض اطراف میں رائج تھی جبکہ اسلام نے بارہ سو سال پہلے اسے منسوخ کیا تھا، لیکن کیا غلامی کی تیسری قسم کو بھی ان ترقی یافتہ حکومتوں نے منسوخ کیا ہے، جسے اسلام نے منسوخ کیا تھا؟ اور کیا ایشیا اور افریقہ وغیرہ میں رہنے والے کروڑوں اقوام اور ملتیں جو صدیوں سے ان کے استعمار اور تسلط میں ہیں ان کے غلام (ارادہ و عمل کے احساس سے محروم) نہیں ہیں؟ صرف اس فرق کے ساتھ کہ غلامی کا نام نہیں لیا جاتا ہے، بلکہ جو برتاؤ گزشتہ زمانے میں ایک فرد سے کیا جاتا تھا وہ آج مجموعی طور پر ایک سماج سے کیا جاتا ہے! جی ہاں! حقیقت یہ ہے کہ ترقی یافتہ حکومتیں، دوسری عالمی جنگ کے بعد اپنی بعض نو آبادیوں کو تدریجاً۔ ان کے اپنے بقول

: سیاسی شعور پیدا کرتے ہیں۔۔آزادی دے رہے ہیں۔لیکن کیا یہی آزادی اور استقلال بخشا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ متمدن انسان آزادی کو اپنی ملکیت جانتے ہیں؟اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ،جو قومیں ان کے بقول وحشی اور پسماندہ ہیں ارادہ و عمل کی آزادی کا حق نہیں رکھتی ہیں،یعنی جب تک زندہ ہیں اپنے آقاؤں اور تہذیب کے قافلہ سالاروں کے غلام اور بندے ہیں۔

اس کے علاوہ کہ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اس استقلال و آزادی کا کیا معنی ہے اور یہ نام اور شکل وصورت کے بدلنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے،ان ترقی یافتہ انسانوں کی غلامی کو سات سمندر کے پانی سے بھی دھویا نہیں جاسکتا۔

اسی طرح غلامی کی چوتھی قسم (جنگی قیدیوں اور جنگ میں شکست کھانے والوں کی آزادی کو سلب کرنے) کے بارے میں ان لوگوں نے کیا رویّے اختیار کئے ہیں دوسری عالمی جنگ کے بعد پیش آنے والے حالات پر تھوڑی سی تحقیق اور غور کرنے سے یہ عقدہ حل ہوتا ہے۔

حریف کے شکست کھانے اور بلا شرط ہتھیار ڈالنے کے بعد،اتحادی،دشمن کے ملک میں داخل ہوئے اور ان کی بھاری صنعتوں سے لے کر ہر کار آمد چیز کو لوٹ لیا اور دشمن کے معروف افراد اور شخصیات میں سے جسے چاہا پکڑ کر اسے قتل کر ڈالا اور دشمن کے ملک کو جس طرح چاہا اپنے تسلط میں قرار دیا اور اب تک کہ اس جنگ کے خاتمہ کو بیس سال گزر چکے ہیں،ابھی تک ان کی مکمل آزادی کے بارے میں کوئی خبر تک نہیں ہے اور ابھی تک مشرقی جرمنی کی مشکل اپنی جگہ پر باقی ہے،اور ابھی بھی (سننے کے مطابق) جرمنی کے دانشوروں کی ایک بڑی تعداد سویت یونین کے زندانوں میں پڑی ہے۔اتحادیوں نے یہ سب محرومیتیں اور سختیاں صرف جنگ میں شرکت کرنے والے اپنے طاقتور دشمنوں سے روا نہیں رکھیں: بلکہ دشمن کے بچوں اور اس جنگ کے بعد پیدا ہونے والے اطفال جو تدریجاً اب تک نشوونما پا رہے ہیں کو بھی پنا غلام قرار دیا ہے اور ابھی بھی یہی حالت جاری ہے اور ہرگز یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ بڑوں کا گناہ تھا اور بچے اس سلسلہ میں کوئی قصور نہیں رکھتے ہیں۔

اتحادیوں کا اس سلسلہ میں صرف یہ استدلال ہے کہ،اس رویہ سے وہ اپنی ہستی اور بقاء کی حفاظت کرتے ہیں اور صرف استثنائی شرائط کے پیش نظر دشمن کے بلاشرط ہتھیار ڈالنے پر اس سے صرف نظر کر کے اسے اپنے حال پر چھوڑا جاسکتا ہے!اور ان کے فرزندوں کو اپنے والدین سے اور ان کی آنے والی نسل کو ان کے اسلاف سے جدا فرض نہیں کیا جاسکتا ہے،مگر استثنائی شرائط کے پیش نظر۔

یہ ایک ایسا استدلال ہے جو ہمیشہ عالم بشریت میں رائج تھا اور اس کے استناد سے فاتح اپنے شکست خوردہ دشمن سے ارادہ و عمل کی آزادی کو سلب کرتا تھا اور اب بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے اور قطعاً آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا،کیونکہ جانی دشمن کو آزاد نہیں رکھا جاسکتا،دشمن کو حقیر اور بے چارہ نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔اب اگر اسلامی قوانین پر توجہ مرکوز کر کے غور کروگے تو دیکھ پاؤگے کہ انہی انسانی قوانین اور فطری معاملوں کو اسلام نے بھی جنگی قیدیوں کے بارے میں استعمال کیا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ یہ لوگ اس کام کو سیاسی زور وزبردستی اور انتہائی بے رحمی اور بزدلانہ صورت میں انجام دیتے ہیں جبکہ اسلام اسے انتہائی صاف گوئی،صداقت،ہمدردی اور بہادری سے نافذ کرتا ہے۔

اگر اسلام کافر حربی کو قیدی بنانے کے بعد غلام بناتا ہے،اگر اسلام قیدی بنانے کے بعد غلامی کو منسوخ کرنے کا سبب نہیں جانتا ہے اور اگر غلاموں کے فرزندوں کو (یہی فرزند کہ آج بیسویں صدی میں بھی اپنے آباء واجداد اور ان کے قومی رسومات کا دم بھرتے ہیں) ان کے والدین کے تابع جانتا ہے،تو یہ انصاف کے خلاف نہیں ہے۔اس کے باوجود کہ اسلام نے ان کی آرام وآسائش اور جلدی آزاد کرنے کے لئے ہر ممکن وسائل مہیا کئے ہیں۔

انسان کا آدم وحوا سے پیدا ہونا

سوال: مہم ترین سوالات میں سے ایک مسئلہ یہ ہے جس کے بارے میں تعلیم یافتہ طبقہ سخت اعتراض کرتا ہے اور یہ مسئلہ متدیّن طبقہ کے لئے سب سے بڑی مشکل بنا ہوا ہے اور وہ اصل خلقت کا قضیہ ہے۔

قرآن مجید واضح طور پر انسان کے جد کو حضرت آدم اور ان کی خلقت کو مٹی سے جانتا ہے، جبکہ بعض انسان شناس دانشوروں نے، برسوں کی تحقیق و تجربہ کے بعد اس مسئلہ میں مختلف نظریہ پیش کیا ہے جو کلی طور پر قرآن مجید کے نظریہ سے متفاوت ہے۔ چونکہ ان دانشوروں نے انسانوں اور حیوانوں کے مختلف انواع پر مدتوں آزمائش اور تجربہ کے بعد اپنا یہ نظریہ پیش کیا ہے، بہر حال امید ہے کہ آپ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں گے۔

جواب: موجودہ انسان کی نسل کے شجرۂ نسب کی ابتداء کے بارے میں دو افراد آدم اور ان کی بیوی کے بارے میں قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے اور قرآن مجید کی آیتیں اس مطلب کے بارے میں صراحت کے نزدیک قوی ظہور رکھتی ہیں، ایسے کہ قطعی برہان کے بغیر مذکورہ ظہور سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے ہم نے اس کے بارے میں تفسیر المیزان میں سورۂ نساء کی ابتداء میں بحث کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ مربوط علوم سے متعلق دانشوروں نے نوع انسان کی پیدائش کے سلسلہ میں جو اپنا نظریہ پیش کیا ہے کہ، جس سے انسان کی اصل بندر یا مچھلی تک پہنچتی ہے ایک علمی فرضیہ (علمی مسائل کی توجیہ کے لئے فرض کیا جاتا ہے) کے علاوہ کچھ نہیں انہوں نے جن دلائل کو پیش کیا ہے وہ اس سے زیادہ استدلال نہیں کرتی ہیں کہ انسان اور اس کی فرض کی گئی اصل دو طبیعی مخلوقات ہیں، جو وجود اور وجود کے آثار کی جہت سے آپس میں کامل و ناقص نسبت رکھتے ہیں اور یہ ایک کے دوسرے سے استخراج یا ایک کے دوسرے میں تبدیل ہونے کے علاوہ ہے، جس کا دعویٰ تبدّل انواع کے مدعی کرتے ہیں۔

خاص کر اس لحاظ سے کہ اسلام میں دین کے بیانات فطری منطق کے مطابق ہیں اور علوم مادی کے دانشور اپنے بیانات میں غالباً "آلگوریزم" ریاضی منطق کی پیروی کرتے ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں: بجلی خاص شرائط میں حرکت یا حرارت یا مقناطیس میں تبدیل ہوتی ہے اور پانی جب ایک سو درجہ پر ابلتا ہے تو اپنی کمیت کو کیفیت میں تبدیل کر کے بخار بن جاتا ہے مثلاً مساوات کے ایک طرف قرار پایا ہوا مثبت عدد دوسری طرف منتقل ہو جانے پر منفی عدد بن جاتا ہے۔ جو آپ نے لکھا ہے کہ یہ دانشور انسان کے لئے لاکھوں سال عمر فرض کرتے ہیں، یہ کسی بھی دین کے منافی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ لاکھوں سال پرانے فُسیل اور زمین کے آثار، پیدا ہونا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتے ہیں کہ اس زمانہ کے انسان اور آج کے انسان ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ ممکن ہے اسی زمین پر مختلف ادوار گزر چکے ہوں اور ان میں سے ہر دور میں انسان کی ایک جدا نسل وجود میں آئی ہو گی اور ایک عمر گزارنے کے بعد وہ نوع نیست و نابود ہوئی ہو گی اور کچھ مدت کے بعد انسان کی ایک اور نسل وجود میں آئی ہو گی۔ چنانچہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ زمین پر انسان کی موجودہ نسل انسانیت کے ادوار کا آٹھواں دور ہے۔

علم نفس اور معرفت نفس میں فرق

سوال: علم نفس اور معرفت نفس میں فرق بیان فرمائیے؟

جواب: عام طور پر علم نفس اس فن کو کہتے ہیں جس میں نفس اور اس سے مربوط مسائل اور اس کی خصوصیتوں کی بحث ہوتی ہے اور معرفت نفس، مشاہدہ کے ذریعہ نفس کی حقیقت کی پہچان کرنے کو کہتے ہیں۔ علم نفس کے ذریعہ نفس کی پہچان "فکری پہچان" ہے اور معرفت نفس کے ذریعہ

''شہودی پہچان'' ہے...

معرفت نفس کا مطلب

سوال: کیا معرفت نفس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے نفس ''روح'' کو مادّہ اور عینی صورت سے ''مجرّد'' مشاہدہ کرے یا یہ کہ اس کے علاوہ کوئی اور مطلب ہے؟ بہر حال استدعا ہے کہ شناخت نفس کے بارے میں آیات و روایات میں بیان ہوئے مطلب کی وضاحت فرمائیے؟

جواب: ''معرفت نفس'' کا مطلب وہی پہلا معنی ہے، یعنی مادّہ سے مجرد نفس کی شہودی شناخت۔ اور جو یہ لکھا گیا ہے کہ ''مادّہ و صورت سے مجرد نفس'' غلط ہے کیونکہ انسان کا نفس اس کی اپنی صورت ہے اور معرفت نفس کا مطلب وہی ''ربّ'' ہے جو روایتوں میں آیا ہے۔

عرفان نفس اور معرفت پروردگار کا رابطہ

سوال: معروف حدیث: ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ''[1]

۱۔ مصباح الشریعہ، ۱۳

''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا یقیناً اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔'' کے معنی میں (مرحوم سید عبد اللہ شبّر کی کتاب مصابیح الانوار میں) بارہ قول بیان ہوئے ہیں، عرفان نفس اور ربّ کی شناسائی کے درمیان کون سا رابطہ ہے، رابطہ کا سبب بیان فرمائیے؟

جواب: اصل روایت اس طرح ہے: (من عرف نفسہ عرف ربہ) اس روایت کے بارے میں جو بارہ معنی بیان ہوئے ہیں، جیسا کہ مجھے یاد ہے، ان میں سے کوئی بھی معنی روایت کا دقیق معنی نہیں ہے، صرف جس صورت کی ''فقد'' کی راہ سے توجیہ کی گئی ہے اسے روایت کے ظاہری معنی قرار دیا جا سکتا ہے اور عرفان نفس اور رب کی شناسائی کا رابطہ اس راہ میں ہے کہ نفس مخلوق اور معلول حق تعالےٰ ہے اور حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی قسم کی آزادی نہیں رکھتا ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے خدا کی طرف سے ہے، اور اس قسم کی مخلوق کا مشاہدہ حق تعالےٰ کے مشاہدہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

معرفت اور لقاء اللہ کا مطلب

سوال: ''اصول کافی'' اور ''بصائر الدرجات'' میں ائمہ اطہار علیہم السلام اور ان کے نورانی مقام کے بارے میں بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں، ان میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار کی پہلی مخلوقات وہی ہیں۔ اسی طرح دوسری روایتوں اور زیارت جامعہ سے یوں استفادہ ہوتا ہے کہ وہ حضرات علیہم السلام اسماء اللہ، وجہ اللہ، ید اللہ، جنب اللہ ہیں، ان احادیث کے پیش نظر کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معرفت اور لقاء اللہ کا مطلب وہی معصومین علیہم السلام کی معرفت ہے؟ جیسا کہ فرمایا ہے: (معرفتی بالنورانیۃ معرفۃ اللہ[1] استدعا ہے کہ

۱۔ (بحار الانوار ۲۶، ۱(

ان احادیث اور معرفت پروردگار کے بارے میں واضح احادیث کو کیسے جمع کیا جا سکتا ہے؟

جواب: معصومین علیہم السلام کی نورانیت کا مقام ان کا کمال ہے اور یہ بلند ترین ممکن کمال ہے اور یہ جو بیان ہوا ہے کہ وہ حضرات علیہم السلام اسماء اللہ، وجہ اللہ، ید اللہ جنب اللہ ہیں یہ توحید کی عمیق ترین بحثوں میں سے ایک بحث ہے اور اس کا تفصیلی بیان یہاں پر ممکن نہیں ہے۔ جو کچھ خلاصہ کے طور پر علمی اصطلاح میں پیش کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ حضرات علیہم السلام اسماء اور صفات خداوندی کے مکمل مظہر ہیں، وہ صاحب ولایت کلیّہ اور فیض الہیٰ کے

چشمے ہیں،ان کی شناخت خدائے متعال کی شناخت ہے۔

نفس کی معرفت خدا کی معرفت کی کنجی ہے

سوال: چنانچہ مرحوم مرزا جواد آقا ملکی کے "رسالۂ لقائیہ" میں درج ہے کہ معرفت نفس میں فکر، معرفت خدا کی کلید ہے۔اس کے پیش نظر کہ نفس مجردات میں سے ہے کیا فکر مجرّدات تک پہنچ سکتی ہے یا نہیں؟اس کے امکان کی صورت میں،استدعا ہے کہ فکر کی راہ کے بارے میں اس رسالہ میں جو کچھ درج ہوا ہے،اس سے واضح تر بیان فرمائیے؟

جواب: فکر مجرّدات تک پہنچ سکتی ہے جیسے مادیات میں پہنچتی ہے۔فلسفہ مجرّدات کے بارے میں بہت سے مسائل حل ہوئے ہیں، لیکن یہاں پر فکر کا مطلب اس کے معروف معنی کے علاوہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک خلوت اور شور وشر سے دور جگہ پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے اپنی صورت پر توجہ کیا جائے ،اس شخص کے مانند جو شیشہ میں اپنی صورت کو دیکھتا ہے اور وہ اس کے ذہن میں پیدا ہونے والی ہر شکل وصورت سے ہٹ کر صرف اپنی صورت کو دیکھتا ہے۔

دو مطالب کی وضاحت

سوال: "رسالہ لقائیہ" میں دو مطالب ذکر ہوئے ہیں پہلا مطلب: "معرفت نفس" میں فکر کے بارے میں فرماتا ہے:

"اشتغل المتفکر تارۃ لتجزیۃ نفسہ،واخریٰ لتجزیۃ العالم حتی یتحقق لہ ان مایعلمہ من العالم لیس الا نفسہ وعالمہ لا العالم الخارجی وان ھذہ العوالم المعلومۃ لہ انما ھو مرتبۃ من نفس"

اس عبارت کے کیا معنی ہیں اور اس کا مقصود کیا ہے؟

دوسرا مطلب: بعد میں فرماتے ہیں: "ہر صورت وخیال کو جب اس کا دل نفی کرے تو پھر عدم میں فکر کرے" نفی اور عدم میں فکر کا مقصود کیا ہے ؟استدعا ہے کہ ان دونوں عبارتوں کے مقصود کو واضح تر بیان فرمائیے؟

جواب: عربی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ قائم ہوئے برہان کے مطابق انسان ہمیشہ اپنے آپ کو تلقین کرے اور جان لے جو کچھ اپنے اور اپنے بیرونی عالم کے بارے میں درک کرتا ہے،اسے اپنے اندر درک کر کے پاتا ہے،نہ یہ کہ بیرونی عالم نے خود پایا ہو۔خیالی صورتوں کی نفی کا مطلب،ان سے اجتناب کر کے صرف اپنی صورت پر اپنے دل کی نظر ڈالتا ہے اور عدم میں فکر کا مطلب اپنی صورت کی طرف فکر کرنا ہے کہ جس کا وجود مجازی ہے اور حقیقت میں عدم ہے۔

خود شناسی کے مقام پر فائز ہونا

سوال: کیا غیر شیعہ اور غیر مسلم،اپنے مذہب سے مربوط عبادتوں اور ریاضتوں کے نتیجہ میں "خود شناسی" کے مقام تک پہنچ سکتے ہیں؟ممکن ہونے کی صورت میں مسلّم ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچانا،اس نے خدا کو پہچانا اور نتیجہ کے طور پر دین مقدس اسلام کے مقصد یعنی توحید تک پہنچا ہے اور اس طرح اسلام کے علاوہ دوسرے راستہ سے مقصد تک پہنچا ہے، کیا یہ فرض ممکن ہے یا نہیں؟

جواب: بعض دانشور اس فرض کو ممکن جانتے ہیں، لیکن کتاب وسنت کے اصلی مدارک واسناد کے ظواہر،اس فرض کے بارے میں موافق نہیں ہیں، مگر یہ کہ مقدمات میں جیسا کمزور فرضی مجاہد فرض کریں۔

خدا کی یاد کا مقصود کیا ہے؟

سوال: قرآن مجید کی آیات میں امر کیئے گئے ''خدا کی یاد میں ہونے'' کا مقصود کیاہ ہے؟ کیا خدا کی یاد، اولیائے خدا کی یاد اور خدا کی نعمتوں کی یاد ہے یا نہیں؟ ''ذکر اللہ'' کے مقصود کو بیان فرمایئے؟

جواب: یاد کرنے کا معنی واضح ہے اور خدا کو یاد کرنے کا مقصود ہر کام کے انجام دینے اور اسے ترک کرنے کی ابتداء میں خدا کی مرضی کے مطابق اسے یاد کرنا ہے، اس سے بڑھ کر ہمیشہ خدا کے حضور میں اپنے آپ کو دیکھنا ہے اور اس سے بلند تر اپنے سامنے خدا کو اس طرح دیکھنا ہے جو ذات اقدس خدا کو دیکھنے کا حق ہے...

کسی چیز سے محروم شخص وہ چیز عطا نہیں کر سکتا

سوال: جیسا کہ واضح ہے ''کسی چیز سے محروم شخص وہ چیز دوسروں کو عطا نہیں کر سکتا ہے'' اگر یہ قاعدہ کلی ہو اور قابل استثناء نہ ہو، تو پروردگار عالم نے کس طرح اشیاء کو جسم بخشا ہے جبکہ وہ خود جسم سے منزّہ ہے؟

جواب: قاعدۂ ''کسی چیز سے محروم شخص وہ چیز عطا نہیں کر سکتا ہے'' ایک فلسفی قاعدہ اور نا قابل استثناء ہے اور اس قاعدہ کے مطابق ہر علت اسی معلول کی حامل ہوتی ہے جس نے اسے ایجاد کیا ہے جیسا کہ ''جعل'' کی بحث میں طے ہوا۔ علت جو اثر معلول پر ڈالتی ہے وہ وجود میں ہے اور علت کا معلول کی ماہیت کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔ اس بناء پر، علّت، جو کمال معلول کو بخشتی ہے، وہ وجود کمال ہے لیکن ماہیت کے سلسلہ میں نہ علت اس کی خالق ہے اور نہ اس پر کوئی اثر کرتی ہے۔ جو کچھ موجودات کو بخشا ہے وہ ان کے وجودی کمالات ہیں، لیکن جسم کا مفہوم اس کی ماہیّت ہوتی ہے اور خدائے متعال نہ ماہیّت رکھتا ہے اور نہ ہی ماہیت عطا کرتا ہے۔

عالم، تغییر و تحوّل کی حالت میں

سوال: کیا اسلام کی نظر میں کائنات تغییر و تحول کی حالت میں ہے؟

جواب: کائنات کے اجزاء میں تغییر و تحوّل کا وجود مشہود، بدیہی اور نا قابل انکار ہے اور قرآن مجید کائنات کے تمام اجزاء میں تغییر و تحوّل کو ثابت کرتا ہے:

)ماخلقنا السّموات والارض وما بینھما الّا بالحق و اجل مسمّیٰ...) (احقاف، ۳(

''ہم نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی تمام مخلوقات کو حق کے ساتھ اور ایک مقرر مدت کے ساتھ پید کیا ہے''...

اس مضمون کی آیات بہت ہیں اور عام طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کائنات کی ہر ایک چیز بعض آثار کی حامل ہے اور کسی ایک مقصد کے تعاقب میں ہے جو اس کا کمال ہے اور اس کی ایک نہایت اور خاتمہ ہے جو اس تک پہنچنے سے اس کی ترکیب منحل ہو کر اپنے اصلی اجزاء کی طرف تجزیہ ہو کر مرکب معدوم ہوتا ہے۔

ثابت قوانین

سوال: کیا کائنات کے تحوّلات مشخص اصول کے مطابق اور نا قابل تغییر ہیں؟ یا یہ کہ خود قوانین کے حالات میں شامل ہوتے ہیں؟

جواب: قرآن مجید کے نظریہ کے مطابق، جو نظام کائنات میں حکم فرما ہے اور جن قوانین کی خلقت کے اجزاء پیروی کرتے ہیں، ایک خدائی روش اور سنت ہے اور خدائی سنّتیں میں یکساں اور نا قابل تغیر ہیں اور ان میں موجود قوانین نا قابل استثنا ہیں:

...)فلن تجد لسنت اللہ تبدیلا و لن تجد لسنت اللہ تحویلا) (فاطر،۴۳(

...''اور خدا کا طریقہ کار بھی نہ بدلنے والا ہے اور نہ اس میں کسی قسم کا تغیر ہو سکتا ہے۔''

...)انّ ربّی علی صراط مستقیم)(ہود،۵۶(

...''میرے پرور دگار کا راستہ بالکل سیدھا ہے۔''

کائنات کا ارتقائی سفر

سوال: کیا، کائنات کی پیدائش کے آغاز سے، کائنات کی حرکت ارتقائی تھی؟ چنانچہ سائنس کہتا ہے: تقریباً دس ارب سال پہلے ہائیڈروجن کے نام پر کائنات کا پہلا ایٹم پیدا ہوا، اس سے پہلے کائنات منتشر گیس کی حالت میں تھی، لیکن دن بدن پیچیدہ تر اور اکٹھا ہوئی، یہاں تک کہکشاں، سیّارے، نظام شمسی، زمین کے چار مراحل، زندگی زندگی کی ارتقاء اور انسان وجود میں آئے؟

جواب: دوسرے سوال کے جواب میں جو آیہ کریمہ بیان ہوئی وہ اس سوال کے بارے میں بھی مطابقت رکھتی ہے۔ جب سے کائنات تھی اور جہاں تک رہے گی پوری کائنات ایک خاص حرکت اور اپنے خاص نظم کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف تکامل و ترقی کا راستہ طے کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ حقیقت میں کائنات کی پیدائش کے لئے دس ارب سال کا فرض کرنا غفلت سے خالی نہیں ہے، کیونکہ زمان کا تعلق ایک کمیّت اور امتداد کے مقولہ سے ہے جو حرکت کے ساتھ قائم ہے اور اس لحاظ سے ہر حرکت اپنے لئے ایک مخصوص زمان رکھتی ہے اور ہم اہل زمین کی نظر میں زمان ایک ایسا امتداد ہے جو دن رات کی حرکت پر قائم ہے اور اس کے پیش نظر کہ یہ تمام انسانوں کے لئے مشہود ہے اس لئے پیائش کا ایک اندازہ مقرر کیا گیا ہے جس کے ذریعہ ہم جزئی حرکتوں کی پیائش کرتے ہیں اور حوادث کا اندازہ لگاتے ہیں۔ ہر زمانہ کے قبل اور بعد ایسی حالتیں ہیں کہ اسی زمانہ کے اجزاء سے موازنہ کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہیں اور اس زمانہ سے باہر ہرگز وجود نہیں رکھتی ہیں، اس لئے کائنات کی عمر کے لئے اس زمانہ سے اندازہ لینا جو زمین کی دوری اور انتقال حرکت کے نتیجہ میں وجود میں آتا ہے، غفلت اور سہل انگاری سے خالی نہیں ہوگا۔

تکامل و ارتقاء کے مراحل اور جدید قوانین

سوال: کیا کائنات میں تکامل کے ہر مرحلہ کے بعد نئے قوانین کا اضافہ ہوا ہے جس طرح کیمسٹری کے قوانین کے نامیاتی مادّہ کے پیدا ہونے کے بعد وجود میں آئے ہیں یا حیات سے مربوط قوانین کے مانند جو حیات کے بعد پیدا ہوتے ہیں؟

جواب: البتہ ہر نئے حادثہ اور مظہر کی پیدائش کے مطابق کائنات میں کچھ نئے قوانین کے مصداق پیدا ہوتے ہیں لیکن نہ اس صورت میں کہ خدائے متعال کی جاری سنت میں تغیر و تجزیہ پیدا ہو جائے، جیسا کہ فرماتا ہے:

)ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نأت بخیر منھا أو مثلھا (...

)بقرہ،۱۰۶(

''اور اے رسول ہم جب بھی کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا دلوں سے محو کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کی جیسی آیت ضرور لے آتے ہیں''...

اور اسی طرح کائنات کی توسیع کے بارے میں فرماتا ہے:

)والسماء بنیناھا بأید و انا لموسعون(

)ذاریات،۴۷(

''اور آسمان کو ہم نے اپنی طاقت سے بنایا اور ہم ہی اسے وسعت دینے والے ہیں ''

کائنات میں تکامل وارتقاء کا عامل

سوال: کیا ایٹم سے لے کر انسان تک پوری کائنات کا ارتقاء کے عامل تضاد ہے؟

جواب: اشیاء کی تخلیق کے بارے میں توصیف کرنے والی قرآن مجید کی آیتوں سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایٹم سے لے کر انسان تک اشیاء کے ارتقاء کے عامل، اشیاء کی اپنی طبیعی اور ذاتی حرکات ہیں چنانچہ انسان کی خلقت کے بارے میں فرماتا ہے:

)الذی احسن کل شیء خلقہ وبدا خلق الانسان من طین * ثم جعل نسلہ من سلالۃٍ من ماءٍ مھین * ثم سوّیٰہ ونفخ فیہ من روحہ وجعل لکم السّمع والاَبصار والاَفئدۃ(...

)سجدہ،۷۔۹(

''اس نے ہر چیز کو حسن کے ساتھ بنایا اور انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا ہے۔اس کے بعد اس کی نسل ایک ذلیل پانی سے قرار دی ہے اس کے بعد اسے برابر کر کے اس میں اپنی روح پھونک دی ہے اور تمہارے لئے کان، آنکھ اور دل بنادئے ہیں''...

قرآن مجید میں اسی موضوع، انسان اور کائنات کے دوسرے مظاہر کے بارے میں بہت سی دوسری آیتیں موجود ہیں۔اور بعض آیتوں میں اس حرکت کی انتہا کو خدا کی طرف پلٹنے اور اس سے ملاقی ہونے کی تعبیر کی گئی ہے:

)یا اَیّھا الانسان انّک کادح الیٰ ربّک کدحاً فملاقیہ(

)انشقاق،٦(

''اے انسان! تو اپنے پروردگار کی طرف جانے کی کوشش کر رہا ہے، تو ایک دن اس کا سامنا کرے گا۔''

)وللہ ملک السّموات والارض والی اللہ المصیر(

)نور،۴۲(

''اور اللہ ہی کے لئے زمین وآسمان کی ملکیت ہے اور اسی کی طرف سب کی بازگشت ہے''

مجموعی طور پر اشیاء کی پیدائش کا آغاز خدا سے ہے اور ارتقاء کے ساتھ ان کی بازگشت خدا کی طرف ہے:

)اللہ یبدوا الخلق ثم یعیدہ ثم الیہ ترجعون(

)روم،۱۱(

''اللہ ہی تخلیق کی ابتداء کرتا ہے اور پھر پلٹا بھی دیتا ہے اور پھر تم سب اسی کی بارگاہ میں واپس لے جائے جاؤ گے۔''

انسانی معاشرے اور تکامل وارتقاء کا آہنگ

سوال: کیا انسانی معاشرے پیدائش سے آج تک ارتقاء کی طرف بڑھ رہے ہیں؟

جواب: گزشتہ سوالوں کے جواب میں مذکورہ آیتوں کا اقتضایہ ہے کہ انسان اپنی انسانی فطرت انسانی کے مطابق ہمیشہ ارتقاء کی طرف چل رہاہے اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا....

انسانی معاشروے کے تکامل وارتقاء کے اہم عوامل

سوال: انسانی معاشروں کے ارتقاء کے اہم عوامل کیاہیں؟

جواب: دین کے نظریہ کے مطابق، انسان ابدی حیات رکھنے والا موجود ہے (جو موت سے نابود نہیں ہوتا) اور اس کی ابدی سعادت۔ جو اس کے ارتقائی وجود کی صورت ہے۔ ایمان اور عمل صالح میں ہے جو اس کی حقیقی نشو ونما اور نفس کی ارتقائی حرکت میں شامل ہے:

)انّ الانسان لفی خسر *الّاالذین آمنواو عملواالصّلحات(...

)عصر، ۲۔۳(

"بیشک انسان خسارہ میں ہے۔ علاوہ ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے"...

ضدوسرے الفاظ میں، برحق اعتقادات کو قبول کرنا، قرب الہیٰ کا سبب بنتاہے اور نیک کام اعتقاد کو استحکام اور تحفّظ بخشتے ہیں:

...)الیہ یصعد الکلم الطیّب والعمل الصلح یرفعہ(...

)فاطر، ۱۰(

... "پاکیزہ کلمات اسی کی طرف بلند ہوتے ہیں اور عمل صالح انھیں بلند کرتاہے"...

علم وغیرہ میں انسان کا تکامل وارتقاء

سوال: کیاانسان کاارتقاء صرف علم میں تھایاتمام زمینوں میں؟

جواب: دین کے نظریہ کے مطابق انسان کامل کا کمال اس کے وجود میں ہے اور تمام زمینوں میں اس کے وجود کی خصوصیتیں ہیں اور اسی کے ساتھ اس کے علم کے ہمراہ بھی ہے۔ قرآن مجید کی آیتوں میں اس کے ارتقاء کے آخری مرحلہ کی توصیف مفصل طور پر آئی ہے اور اس کی حالت کی توصیف میں جامع ترین کلمہ آیہ کریمہ ہے:

)لھم مایشاءون فیھاولدینامزید(

)ق، ۳۵(

"وہاں ان کے لئے جو کچھ بھی چاہیں گے سب حاضر رہے گا اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔"

ان بحثوں کے دوران جن آیات کریمہ کا ہم نے ذکر کیا، مزکورہ مطالب کو ثابت کرنے میں کافی ہیں، لیکن چونکہ حقیر کی صحت ٹھیک نہیں تھی، اس لئے آیات کو مفصل وضاحت سے پرہیز کیاگیا۔ آیات کی کیفیت کی دلالت واضح ہونے کے لئے تفسیر "المیزان" کی طرف رجوع کیاجاسکتاہے۔

مجرّدات کے وجود کو اثبات کے دلائل

سوال: امکان اشرف کے علاوہ مجرّدات کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے کوئی دوسری عقلی دلیل کیاہے؟

جواب: اس سلسلہ میں شیخ کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے، جو امکان اشرف کا قائل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مجرّد کے وجود کو (ذات اور فعل میں مجرد کے معنی میں) دوسرے مختلف طریقوں سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ہم کہیں کہ ابتدائی طور پر صادر کو مجرّد ہونا چاہئے، تاکہ اس میں ارتقا کی قدرت بھی ہو، لیکن فعلیت کی صورت میں کمال رکھتی ہو (اور اس میں مزید فعلیت اور کمال نہیں آ سکتا) اور اگر فرض کیا جائے کہ اس میں تکامل کی قوت بھی موجود ہو تو یہ صادر مادی اور مادہ اور صورت کا مرکب ہو گا اور اس صورت میں کسی چیز کے اجزاء خود اس چیز پر وجودی صورت میں مقدم ہونے لگیں گے اور مادہ و صورت اس صادر سے قبل موجود ہوں گے، حالانکہ ہمارا فرض یہ ہے کہ صادر اب وجود میں آ رہا ہے۔

اسی طرح ثابت شدہ صور علمیہ کے تجرد سے نفس کا ذاتی تجرد اور نفس کے تجرد کے ذریعہ اس کی علت فاعلی کے تجرد تام کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔

ختم نبوت کی عقلی دلیل

سوال: ختم نبوت کے بارے میں عقلی دلیل کیا ہے؟

جواب: کتاب "برہان از منطق" میں ثابت ہوا ہے کہ جزئی اور شخصی حکم کی عقلی دلیل نتیجہ بخش نہیں ہے، لہذا نبوت عامہ کے مقابلہ میں نبوت خاصّہ کو عقلی دلیل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وضاحت یہ ہے کہ نبوت اور رسالت کا سلسلہ انسان کے ارتقاء کے لئے اور اس کی ہدایت و راہنمائی کے لئے ہے، کمال کے مراتب اور آسمانی شریعتوں کا تعدّد تدریجی ارتقاء کے لئے ہے، جیسے انسان نے زمانہ کے گزرنے کے ساتھ اسے حاصل کیا ہے کہ ہر شریعت گزشتہ شریعت کو کامل کرنے کا درجہ رکھتی ہے اور اس کو منسوخ کرنے والی ہوتی ہے اور واضح ہے کہ انسان لامتناہی کمالات کا مالک نہیں ہے، جن کمالات کی صلاحیت رکھتا ہے، جتنے بھی زیادہ ہوں، بالآخر ایک مرحلہ پر ختم ہوتے ہیں، نتیجہ کے طور پر جو نبوت اس مرحلہ کی ضامن ہے، وہ خاتم نبوت ہے اور جو نبوت شریعت کو لائی ہے وہ قیامت تک مستحکم اور واجب العمل ہے۔ اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے آسمانی شریعتوں میں ایک ایسی شریعت ہو گی جو شریعتوں کو خاتمہ بخشنے والی ہو گی۔

روایتوں کے مطابق بھی اسلام کی مقدس شریعت، ایک آسمانی اور برحق شریعت کو خاتم النبیین اور قرآن مجید کو ناقابل تنسیخ کتاب کے طور پر تعارف کرا گیا ہے:

...)ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین(...

)احزاب، ۴۰(

...)وانّہ لکتابٌ عزیز* لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیمٍ حمید(

)فصلّت، ۴۱۔۴۲(

"اور یہ ایک عالی مرتبہ کتاب ہے۔ جس کے قریب سامنے یا پیچھے کسی طرف سے باطل آ بھی نہیں سکتا ہے کہ یہ خدائے حکیم و حمید کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔"

پیغمبروں کی نسبت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت اور آسمانی شریعتوں کی نسبت شریعت اسلام کی خاتمیت ثابت ہوتی ہے۔

گزشتہ بحث سے یہ مطلب بھی واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے نبوت کا باب بند ہوا ہے اس لئے لوگوں کی عقلیں مکمل ہو چکی ہے اور اب وحی اور آسمانی احکام کی ضرورت ہی نہیں ہے اس صورت میں اسلام کی وسیع شریعت

اور احکام کے لئے کوئی معنی باقی نہیں رہتا۔

عدالت اور عصمت میں فرق

سوال: عدالت اور انبیاء کی عصمت۔نہ ملائکہ کہ قوۂ غضبیہ اور قوۂ شہوانیت نہیں رکھتے۔کے درمیان کیا فرق ہے ؟

جواب: عدالت ایک طاقت اور ملکہ ہے جس سے انسان عملی طور پر گناہان کبیرہ اور گناہان صغیرہ پر اصرار کرنے سے اجتناب کرتا ہے اور ممکن ہے اصرار کے بغیر گناہان صغیرہ کا مرتکب ہو جائے۔اور ''عصمت'' ایک ایسی طاقت ہے جس کے ذریعہ انسان کے لئے مطلق معصیّت، خواہ گناہان کبیرہ ہو یا صغیرہ کا انجام دینا محال ہوتا ہے۔اور قرآن مجید کی آیات سے یہ استفادہ کیا جاتا ہے کہ عصمت علم کی ایک قسم ہے۔یہ معصیّت کے قبیح ہونے کا علم ہے جس کے ہوتے ہوئے معصیّت ہرگز انجام نہیں پاتی، ایک شخص کے مانند جیسے ایک مایع کے بارے میں قطعی علم ہو کہ وہ ایک مہلک زہر ہے وہ ہرگز اسے نہیں کھائے گا اور نتیجہ کے طور پر معصیّت کا مرتکب ہونا ایک عادل کے لئے ممکن ہے لیکن ایک معصوم کے لئے ممکن نہیں ہے۔

تکوین کا تغییر ناپذیر ہونا

سوال: باوجودیکہ عصمت انبیاء پر عقلی دلیل کو مسلمات بلکہ مذہب شیعہ کی ضرورت میں شمار کیا گیا ہے، لیکن مذکورہ ادلّہ میں ''عیال کے ساتھ ایک غیر حاضری'' مثلاً شامل نہیں ہوتی اور فرض کریں شامل ہو جائے، تو عدالت کافی ہے اور فرض کریں ادلّہ تمام ہو، رسالت سے نسبت بیان احکام ہے، جو سہو ونسیان سے محفوظ ہے اور دوسرے گناہوں کی نسبت تمام نہیں ہے اور بنیادی طور پر اس موضوع کے اثبات پر اصرار کرنے والا داعی کون ہے ؟ اگر ایک شخص عادل خطا ونسیان سے محفوظ، پیغمبر ہو تو اس کا فاسد کیا ہے ؟

جواب: نبوت عامہ کو ثبت کرنے والی عقلی دلیل کے مطابق، وحی آسمانی کے ذریعہ بشر کی ہدایت خلقت تکوینی کا جزو ہے، اور تکوین میں خطا اور تخلف معقول نہیں ہے تاکہ وحی کے مضامین کے نتائج جو مصدر وحی سے صادر ہوتے ہیں، ہو بہو لوگوں تک پہنچ جائیں، یعنی نبی وحی کے قبول کرنے، اس کے ضبط وتحفّظ اور اسے لوگوں تک پہنچانے میں کسی قسم کی خطا وخیانت نہیں کرنی چاہئے، اس کی بات محفوظ ہونی چاہئے اور اس کا فعل بھی ہر قسم کے تخلف و معصیت سے پاک ہونا چاہئے، کیونکہ اس کا فعل تبلیغ کے مصادیق میں سے ہوتا ہے، یعنی نبوت سے قبل اور بعد اس کا قول و فعل معصیت، اعم از گناہان کبیرہ و صغیرہ، سے منزّہ اور پاک ہونا چاہئے، کیونکہ یہ سب مراحل بیان احکام سے مربوط ہیں اور احکام سے باہر کوئی معصیت نہیں ہے۔اس بحث کے بہت سے ابعاد ہیں، مزید وضاحت کے لئے ''المیزان'' کی تیسری جلد یا کتاب ''اسلام میں شیعہ'' یا رسالہ ''وحی وشعور مرموز'' کی طرف رجوع کریں

۔

تشہد میں (ارفع درجتہ) کا مقصود

سوال: فلسفیوں کی تعریف کے مطابق انسان کامل وہ ہے جس کے لئے ''کل مایمکن لہ بالامکان العالم'' فعلی ہو چکا ہو گا اور ہر ایک کے اتفاق کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا منحصر مصداق ہیں یا افراد انسان کامل میں سے ہیں، اس صورت میں تشہد میں پڑھی جانی والی دعا ''ارفع درجتہ'' یا یہ کہ ''بلند درجہ پر پہنچا ہے'' کا سبب کیا ہے ؟

جواب: مذکورہ دعا اور اسی طرح صلوات اس عطیہ کا سوال ہے جو خدائے متعال کی طرف سے قطعی طور پر ملنے والا ہے اور حقیقت میں خدائے تبارک وتعالی کی طرف سے اپنے رسولؐ اور حبیب پر کی گئی عنایت کے سلسلہ میں راضی ہونے اور دلی خوشحالی کا اظہار ہے۔

گزشتہ سوالات کے مجدد جواب

السلام علیکم ورحمۃاللہ وبرکاتہ

آپ کا دوسرا خط ملا۔ یاد آوری کے لئے بہت بہت شکریہ۔ ارسال کئے گئے جوابات کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ نامکمل ہیں، لگتا ہے جواب کے متن پر دقت سے غور نہیں کیا گیا ہے:

ا۔ آپ نے لکھا ہے: ''مجرّدات کا ثبوت گمراہ جوانوں کے لئے چاہتے ہیں جو خدا کے منکر ہیں اور ماورائے طبیعت کے قائل نہیں ہیں اور خط میں جو دلیل ذکر کی گئی ہے وہ وجود خدا کی فرعی دلیل ہے اور کارآمد نہیں ہے۔''

یہ مسئلہ، ایک فلسفی مسئلہ ہے اور مختلف طریقوں سے ثابت ہوا ہے اور جو کچھ خط میں ذکر کیا گیا تھا یہ ہے کہ صورت علمیہّ کے تجرّد کو اس راہ سے کہ عمومی مادہ کی خصوصتیں (تغیر، زمان اور مکان) نہیں رکھتا ہے ثابت کریں اور اس کے بعد انسانی نفس کے تجرّد کو اس راہ سے کہ بدون تغیّر انسان کے لئے مشہود ہے اور یہ کہ علمیہ صورت اس سے قائم ہے، ثابت کریں اور اس کے بعد نفس مجرّدہ کی علّت فاعلی کے تجرّد کو اس راہ سے ثابت کریں کہ علت کو وجود کی حالت میں قوی طور پر معلول سے ہونا چاہئے اور اضعف امر مادی وجوداً مجرّد ہے۔

مذکورہ برہان ایک مکمل برہان ہے اور واجب الوجود کو ثابت کرنے میں کسی قسم کی کمی نہیں رکھتا ہے، چونکہ مقصد یہ ہے یہ مسئلہ ناواقف افراد کو سمجھایا جائے، اس لئے اس کا بیان کسی حد تک سادہ اور عام فہم ہونا چاہئے۔

۲۔ آپ نے لکھا ہے: ''خط میں، ختم نبوت کے بارے میں ذکر کیا گیا عقلی برہان اچھا ہے، لیکن مذکورہ ذکر کی گئی قرآنی آیات دلالت نہیں کرتی ہیں شریعت ناسخ ''یاتیہ الحق من خلفہ'' ہے نہ ''یاتیہ الباطل''۔

باطل کا مطلب ایک قرآنی حکم ہے کہ جو ناسخ شریعت کے ذریعہ منسوخ اور باطل ہوتا ہے اور نتیجہ کے طور پر ایک باطل حکم قرآن مجید میں داخل ہوتا ہے نہ ناسخ شریعت جو بالفرض حق ہوگی نہ باطل۔

۳۔ آپ نے لکھا ہے: ''تشریع'' کا مطلب، معصیت وخطا کے بغیر حکم پہنچانا ہے اور یہ امر مبلغ کی عدالت سے بھی انجام پاتا ہے، اور عصمت کی ضرورت نہیں ہے اور جو کچھ تکوینی ہے اصل شریعت کو جعل کرنا اور تبلیغ ہے نہ اس کے جزئیات اور رات کے وقت پیغمبر کی اپنے عیال کے ساتھ یک مخفیانہ غیبت ہر گز جزء تکوینی اور احکام کی تبلیغ نہیں ہے۔

تکوین کا مطلب مرحلہ ایجاد اور وجود خارجی ہے۔ اگر خارج میں موجود انسان خدائے متعال کے ارداۂ تکوینی سے متعلق ہو، تو ضروری طور پر اس کے وجودی آثار، اس کا وجودی مقصد اور مقصد کی طرف اس کا راستہ سب کے سب تکوینی ہوں گے، پھر یہ کہنا معقول نہیں ہے کہ اصل خلقت تکوینی ہے اور اصل شریعت تکوینی ہے، لیکن حکم پہنچنے کے مصادیق اور اس کی تبلیغ وضعی اور قراردادی اور غیر تکوینی ہیں اس کے مانند کہ کہا جائے اصل تغذیہ انسان کے لئے تکوینی طور پر مقدر ہوا ہے، لیکن تغذیہ کے مصادیق اور غذا سب وہمی اور خیالی ہیں۔ یا یہ کہا جائے کہ مبلغ کا قول وفعل اور تبلیغ اصل ہے، لیکن اس کے مصادیق تبلیغ نہیں ہیں اور ممکن ہے مبلغ تمام ان احکام میں خلاف ورزی کرکے گناہان کبیرہ وصغیرہ کا مرتکب ہو جائے جن کے بارے میں اسے تبلیغ کرنی چاہئے، کیونکہ عدالت، معصیت انجام پانے کو محال نہیں بناتی۔

اور یہ جو آپ نے خط میں لکھا ہے: ''پیغمبر کی اپنے عیال کے ساتھ شبانہ غیبت تبلیغ نہیں ہے، مضر بھی نہیں ہے۔'' بہت عجیب ہے! کیا پیغمبر کی بیوی پیغمبر

کی امت کا جزو نہیں ہے اور اسے تبلیغ کی ضرورت نہیں ہے یا پیغمبر کی بیوی اور دوسرے لوگوں میں کوئی فرق ہے؟ یا یہ کہ اگر بڑی معصیت کا مخفیانہ ارتکاب ایک یادو افراد سے انجام پائے تو تبلیغ کی ضرورت نہیں ہے اور اگر علنی انجام پائے تو تبلیغ ہے؟ مختصر یہ کہ نبی میں عصمت کے بجائے عدالت کا اعتبار لازم و ملزوم ہے۔ قولاًاور فعلاً نبی سے کبیرہ و صغیرہ معصیت کا انجام پانا جائز ہونے کی صورت میں تمام احکام میں خلاف ورزی جائز ہوگی اور یہ مطلب تکوین کی بنیاد سے اختلاف رکھتا ہے۔

۴۔ آپ نے لکھا ہے: تشہد میں ''ارفع درجتہ'' کا لفظ واضح طور پر دعا اور ارتقاء کے خلاف ہے۔

خدائے متعال نے کمال امکان کا آخری درجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کرکے اسے ختم فرمایا ہے، اس کے باوجود اس کی لا متناہی قدرت محدود نہیں ہوئی ہے اور اگر وہ چاہے تو عطا کی ہوئی چیز کو واپس بھی لے سکتا ہے۔

...) قل فمن یملک من اللہ شیئاًان اراد ان یھلک المسیح ابن مریم وامہ و مَن فی الارض جمیعا(...

)مائدہ ۱۷(

... ''پیغمبر! آپ ان سے کہئے کہ پھر خدا کے مقابلہ میں کون کسی امر کا صاحب اختیار ہوگا اگر وہ مسیح ابن مریم اور ان کی ماں اور سارے اہل زمین کو مار ڈالنا چاہے''...

اس بناء پر،، دعا فیض کو جاری رکھنے کے لئے ہے اور حتمی امر کے پھیلاؤ کے لئے دعا کرنا مناسب ہے اور دعا واضح طور پر عیب اور کوتاہی میں ہے لیکن ہماری بحث میں عیب وہی ذاتی امکان فقر و حاجت ہے نہ بالفعل عیب۔

۵۔ ولایت کی شہادت ''علی ولی اللہ'' میں لفظی اضافہ نہیں ہے اور اس کا یہ معنی ہے کہ وہ ایک ایسا ولی ہے کہ خدا نے اسے ولی قرار دیا ہے۔

یونانی فلسفہ کے ترجمہ کا مقصد

سوال: کیا یونانی فلسفہ ''الٰھیات'' جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی چند صدیاں گزرنے کے بعد یونانی کتابوں کے عربی میں ترجمہ کئے جانے کے نتیجہ میں مسلمانوں کے معاشرہ میں داخل ہوا، صرف اس لئے تھا کہ مسلمان بیرونی ممالک کے علوم سے آشنا ہوجائیں یا یہ کہ لوگوں کو اہل بیت رسولؐ کی طرف رجوع کرنے سے روکنے کا ایک بہانہ تھا؟

جواب: دوسری اور تیسری صدی ہجری میں نہ صرف یونانی الٰہیات کا عربی میں ترجمہ ہوا ہے بلکہ بہت سے علوم، جیسے: منطق، علوم طبیعی، علوم ریاضی اور طب وغیرہ بھی یونانی، سریانی اور دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ ہوئے ہیں، لہذا جبکہ پہلی صدی ہجری میں خلفائے وقت کے حکم سے قرآن مجید کے لکھے جانے کے علاوہ ہر چیز، حتی حدیث اور تفسیر لکھنے پر بھی زبردست ممانعت تھی، تاریخ شاہد ہے کہ، بہت سی کتابیں (اطلاع کے مطابق تقریباً دو سو کتابیں)اس وقت کی دنیا میں مختلف علوم کے بارے میں رائج تھیں، ترجمہ ہوئی ہیں۔ ظاہراً یہ کام ملت اسلامیہ کی بنیادوں کو مستحکم بنانے اور دینی مقاصد کو عملی صورت دینے کی غرض سے انجام پایا ہے، چنانچہ قرآن مجید خلقت کے تمام ابعاد، آسمانی اور زمینی مخلوقات اور انسان و حیوان کے بارے میں تعقل و تفکر کرنے کی تاکید کرتا ہے اور اس کے مطابق مسلمانوں کو مختلف علوم کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہئے۔

اسی دوران، وقت کی حکومتیں ائمہ ھدیٰ کو۔ جن سے وہ دوری اختیار کر چکے تھے۔ ہر طریقے سے سرکوب کرنے اور لوگوں کو ان کے علوم سے استفادہ نہ

کرنے اور ان کی طرف رجوع کرنے سے روکنے کے لئے کوئی کسر باقی نہ رکھی ہے اس کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ الٰہیات کا ترجمہ اہل بیت علیہم السلام کے گھر کو بند کرنے کے لئے انجام دیا گیا تھا۔

لیکن کیا وقت کی حکومتوں کے الٰہیات کے ترجمہ اور ترویج سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا یہ مقصود، ہمیں ان بحثوں سے بے نیاز کر کے اس امر کا سبب بن سکتا ہے کہ ہم اس کام سے پرہیز کریں؟

خود الٰہیات، محض عقلی بحثوں کا ایک مجموعہ ہے جن کا نتیجہ صانع، اس کا واجب الوجود، وحدانیت اور اس کے دیگر صفات کمال کو ثابت کرنا اور نبوت و معاد سے اس کے وجود کی ضرورت کو ثابت کرنا ہے۔ اور یہ ایسے مسائل ہیں جو "اصول دین" کے نام پر ابتداء میں عقل کی راہ سے ثابت ہونے چاہئیں جب تک کتاب و سنت کی تفصیلی دلیل حاصل ہو جائے، ورنہ کتاب و سنت کی حجت کا کتاب و سنت سے ہی استدلال کرنا گردشی اور باطل ہے۔ حتی جو مسائل اصول دین کے بارے میں، جیسے وجود خدا، وحدانیت اور اس کی ربوبیت کے سلسلہ میں کتاب و سنت میں بیان ہوئے ہیں، ان سب کا عقل سے استدلال کیا گیا ہے۔

یونانی فلسفہ سے اسلامی معارف کی بے نیازی

سوال: کیا یونانی فلسفہ (الٰہیات) جو کچھ اپنے ہمراہ لایا ہے، اسلام کے متن اور معصومین علیہم السلام کی فرمائشات میں موجود ہے یا نہیں؟ چنانچہ اگر وہ مطالب موجود ہیں تو فلسفہ کی کیا ضرورت ہے اور اگر موجود نہیں ہیں تو معلوم ہوا کہ یونانی فلسفہ معارف اسلامی کے مکمل ہونے کا سبب بنا ہے؟!

جواب: دینی بیانات اور کتاب و سنت کے مشتملات میں تمام اعتقادی و عملی معارف اجمالاً یا تفصیلاً موجود ہیں، لیکن اس کے پیش نظر کہ دین کے مخاطب دنیا کے تمام لوگ، مشمول عالم و جاہل، ذہین اور کند ذہن، شہری اور دیہاتی اور مرد و زن ہیں اس لئے دین ایک ایسی زبان سے گفتگو کرتا ہے تاکہ ہر ذہن۔ ان کے درمیان موجود اختلاف کے باوجود۔ اپنی ظرفیت کے مطابق اس سے استفادہ کر سکے۔ اس صورت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ان ہی معارف کے بارے میں بلند سطح میں بحث کر کے، ان کے عالی افہام سے مخصوص مطالب کو حاصل کر کے انھیں استخراج کر سکتے ہیں اور مطالب کو ترتیب دینے اور مسائل کو منظم کر کے اصطلاحات کے ایک سلسلہ کو وضع کرنے کے علاوہ کوئی چارہ اور گریز نہیں ہے۔

لہذا کتاب و سنت کے متن میں الٰہیات کے مسائل اور معارف کا موجود ہونا، ان مسائل کے بارے میں عالی سطح پر ایک خاص علم کو وضع کرنے سے بے نیاز نہیں بن سکتا ہے، کیونکہ دوسرے علوم میں بھی یہی حالت ہے، مثلاً علم کلام ایک ایسا علم ہے کہ اس کے مسائل کتاب و سنت میں موجود ہیں، جبکہ مستقل طور پر اور الگ سے بھی منظم کئے گئے ہیں اور ان مسائل کا کتاب و سنت میں موجود ہونا انھیں الگ سے منظم کئے جانے سے بے نیاز نہیں کرتا۔

اور یہ کہ سوال میں کہا گیا ہے: "اگر الٰہیات کے بعض مسائل کتاب و سنت کے متن میں موجود نہ ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ یونانی فلسفہ معارف اسلامی کو مکمل کرتا ہے!"، یعنی اسلام ناقص ہے اور اس کے نواقص کو فلسفہ دور کرتا ہے، یہ ایک اشتباہ ہے، اس دلیل سے کہ ہم اسلام کے حقیقی معارف میں سے حتی ایک مسئلہ کو بھی منطق کی مدد کے بغیر ثابت نہیں کر سکتے ہیں، جب کہ کتاب و سنت کے متن میں منطقی مسائل ذکر نہیں ہوئے ہیں اور اسی طرح دین کے فرعی مسائل (احکام) میں سے حتی ایک مسئلہ کو بھی علم اصول سے استفادہ کئے بغیر استنباط نہیں کر سکتے ہیں، جبکہ کتاب و سنت کے متن میں اس وسیع علم کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے، معارف اسلامی کے سلسلہ میں منطق اور فقہی مسائل کے بارے میں علم اصول کا طریقہ ہے اور طریقہ، مکمل اور تکمیل میں فرق ہے۔

عصر ملاصدرا میں فلسفہ کا عروج

سوال: صدیوں بعد شیعوں کی پائدار کوششوں کے نتیجہ میں فلسفہ (ملاصدرا شیرازی کے زمانہ میں) عروج تک پہنچا، کیا جو کچھ مرحوم ملاصدرا نے اپنی کتاب ''اسفار'' میں لکھاہے، اسے آیات و روایات کے متون سے ثابت کیا جاسکتا ہے یا یہ کہ آیات و روایات کو صرف اس پر منطبق کیا جاسکتا ہے؟

جواب: یہ جو ہم کہتے ہیں: فلسفہ اپنے عروج تک پہنچا ہے، اس کا یہ معنی ہے کہ حالیہ فلسفی مباحث گزشتہ بحثوں کے مقابلہ میں حقیقت کے معارف کے مناسب ایک عالی سطح پر قرار پائے ہیں، نہ یہ کہ فلسفی کتابوں کے مضامین جیسے ''اسفار''،''منظومہ'' وغیرہ حقیقی متن، وحی منزل اور ہر خطا اور اشتباہ سے پاک ہوں، ایسا نہیں ہے بلکہ مذکورہ کتابیں چونکہ صحیح ہیں ممکن ہے ان میں غلطی بھی ہو۔ بہر حال محقّق برہان ہے نہ صاحبان سخن کی شخصیت۔

قرآن مجید اور کلام معصومین (ع) سے حکماء اور فلاسفہ کے بیان کا رابطہ

سوال: اگر فلسفہ، (الٰہیات) کا آیات اور روایات سے تعبیر میں اختلاف کے علاوہ کوئی فرق نہیں ہے تو پروردگار اور ائمہ اطہار علیہم السلام نے جو کچھ تعبیر کے طور پر فرمایا ہے وہ کامل و اکمل ہے، پھر حکماء اور فلاسفہ کی تعبیرات کی کیا ضرورت ہے؟

جواب: اگر ہم یہ کہیں کہ فلسفہ اور آیات و روایات میں تعبیر میں اختلاف کے علاوہ کوئی فرق نہیں ہے، تو مطلب (جیسا کہ دوسرے سوال کے جواب میں کہا گیا) یہ ہے کہ کتاب و سنت میں پائے جانے والے حقیقی معارف فنّی اور علمی اصطلاحات کی زبان میں عقلی بحثوں کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں اور ان دو مرحلوں کے درمیان فرق وہی عمومی اور سادہ زبان اور فنّی اور خصوصی زبان کا فرق ہے، نہ یہ کہ دینی بیانات فصیح و بلیغ تر ہیں۔

فلاسفہ کی مذمت میں موجودہ روایتوں کی توجیہ

سوال: جو روایتیں اہل فلسفہ کی مذمت میں خاص کر آخر الزمان کے دورہ کے بارے میں بیان ہوئی ہیں، چنانچہ احادیث کی کتابوں، جیسے ''بحار الانوار''، اور ''حدیقۃ الشیعہ'' میں لکھا گیا ہے، کن لوگوں کے بارے میں ہیں اور ان روایتوں کا مقصود کیا ہے؟

جواب: دو تین روایتیں جو بعض کتابوں میں آخری الزمان میں اہل فلسفہ کی مذمت میں نقل ہوئی ہیں، صحیح ہونے کی صورت میں اہل فلسفہ کی مذمت میں ہیں نہ خود فلسفہ کی مذمت میں۔ چنانچہ بعض روایتیں آخر الزمان کے فقہا کی مذمت میں بھی نقل ہوئی ہیں وہ فقہا کی مذمت میں ہیں نہ فقہ اسلامی کی مذمت میں۔ اسی طرح بعض روایتیں آخر الزمان کے اہل اسلام اور اہل قرآن کی مذمت میں نقل ہوئی ہیں:

''لا یبقیٰ من الاسلام الا اسمہ ولا من القرآن الا اسمہ''[1]

یہ روایت خود اسلام اور قرآن کی مذمت میں نہیں ہے۔

اگر یہ روایتیں خبر واحد ظنّی ہوتیں تو خود فلسفہ کے بارے میں ہوتیں، اور فلسفی مسائل (جیسا کہ دوسرے سوال کے جواب میں بیان ہوا) مضمون کے لحاظ سے وہی مسائل ہیں جو کتاب و سنت میں درج ہیں، یہ مذمت بالکل کتاب و سنت کی مذمت کے مانند تھی، اس لئے ان مسائل کو جبری طور پر تسلیم کئے بغیر آزاد استدلال میں شامل کیا گیا ہے۔ اصولاً کیسے ممکن ہے کہ ایک خبر ظنّی ایک قطعی و یقینی برہان کے مقابلہ میں آکر اسے باطل کرے؟!

تہذیب اخلاق کا شیوہ

سوال: امیر المؤمنین علیہ السلام کے زمانہ میں اجتماعی رد عمل کی بنا پر حضرت کے شیعہ دو گرہوں میں تقسیم ہوئے ہیں:

پہلا گروہ، وہ لوگ ہیں جو اجتماعی شور و غوغا اور کشمکشوں سے دور رہ کر صرف اپنی

اصلاح اور تہذیب نفس میں لگ گئے (اویس قرنی اور کمیل وغیرہ کے مانند) یہاں تک حضرتؑ کے رکاب میں شہید ہوئے یا کسی دوسرے کے ہاتھوں قتل

ہوئے اور بالآخر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

دوسرا گروہ، وہ لوگ تھے جو پہلے گروہ کے بر خلاف، اجتماعی پکڑ دھکڑ اور کشمکشوں میں داخل ہوئے اور ہر جگہ سر گرم تھے، جیسے: مالک اشتر وغیرہ۔

۱۔ بحار الانوار ۳۶، ۳۸۴، ترجمہ: اسلام کے نام کے بغیر اور قرآن کے نام کے بغیر کچھ باقی نہ بچے گا

حالیہ صدیوں کے دوران بھی یہ دو گروہ موجود تھے۔ پہلے گروہ سے مرحوم حاج ملا حسین علی ہمدانی اور اس کے خاص شاگردوں اور دوسرے گروہ سے

مرحوم آقا شیخ محمد حسین کاشف الغطا اور سید شرف الدین جبلی عاملی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا تہذیب اخلاق معاشرہ کے اندر ممکن ہے یا اس کے لئے گوشہ نشینی اور تنہائی اختیار کرنا ضروری ہے؟ ان دوروشوں میں سے کس

روش کی اسلام اور اس کے پیشوا تائید کرتے ہیں اور اسلام کے بلند مقاصد کی ترقی کے لئے موثر ہے؟

جواب: جو کچھ کتاب وسنت سے حاصل ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام مکمل خداشناسی اور مخلصانہ بندگی چاہتا ہے، اس طرح کہ انسان خدائے متعال کے علاوہ

کسی سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اس کمال اور ارتقاء سے جو کچھ ممکن ہے وہ مطلوب ہے، کم ہو یا زیاد:

)اتّقوا اللہ حق تقاتہ (...

)آل عمران، ۱۰۲(

...''اس طرح ڈرو جو ڈرنے کا حق ہے''...

اور:

)ففرّوا الی اللہ انی لکم منہ نذیر مبین (

)ذاریات، ۵۰(

''لہٰذا اب خدا کی طرف دوڑ پڑو کہ میں کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔''

اسلام ایک اجتماعی دین ہے جس نے رہبانیت اور گوشہ نشینی کو منسوخ کر دیا ہے جو لوگ تہذیب نفس، ایمان کی تکمیل اور خداشناسی میں مشغول ہیں

، انھیں کمال کو اجتماع کے متن میں دوسروں کی مشارکت سے حاصل کرنا چاہئے۔ ائمہ ھدیٰ علیہم السلام کی تربیت یافتہ لوگ بھی صدر اسلام میں اسی رویہ

پر کاربند تھے۔ سلمانؓ، جو ایمان کے دسویں درجہ پر فائز تھے، مدائن میں حکومت کرتے تھے اور اویس قرنی، جو کمال و تقویٰ کی ضرب المثل بن چکے تھے

، نے جنگ صفین میں شرکت کی اور امیر المومنین کے رکاب میں شہید ہوئے۔

خلقت عالم کی کیفیت

سوال: چونکہ خدائے متعال کا وجود لا محدود ہے اور عالم محدود کو خلق کرنے سے پہلے ہر جگہ موجود تھا، پس کائنات کو کیسے پیدا کیا؟ کیا اپنے وجود کے اندر کہ

ناممکن ہے؟ اور اگر اپنے وجود اقدس سے باہر تھا تو اس صورت میں لازم ہوتا ہے کہ خود اس کائنات کے ساتھ نہ ہو یا یہ کہ خود۔ نعوذ باللہ۔ عین مخلو

قات ہے، یہ وہی فاسد عقیدہ (وحدت وجود) ہے، پس خدائے متعال نے کائنات کو کیسے پیدا کیا تا کہ اس کے مقدس وجود کے ساتھ تضاد نہ ہو؟

جواب: بنیادی طور پر سوال کو غلط صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سوال کے مقدمہ میں کہا گیا ہے: ''خدائے متعال کا وجود لا محدود ہے اور ہر جگہ پر تھا''، جبکہ سب سے پہلے: خلق کرنے سے پہلے نہ ''جگہ'' کا کوئی معنی ہے اور نہ ''ہر جگہ'' کا دوسرے یہ کہ خدا کا ہر جگہ پر ہونا، اس کے وجود کے لا محدود ہونے سے ماخوذ ہوا ہے، یعنی خدا کا وجود ایک لا متناہی جسم فرض کیا گیا ہے جو مطلق مکان میں پھیل گیا ہے اور دوسروں کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رکھی ہے، جبکہ خدائے متعال کا وجود مادّہ، جسم اور حجم سے منزّہ و پاک ہے۔

لهذا، اس کے لئے نہ کسی مکان کا فرض کیا جاسکتا ہے اور نہ زمان کا۔ اس کا وجود داخل اور خارج سے بھی منزّہ ہے... نہ کسی چیز میں داخل ہوتا ہے اور نہ کسی چیز سے خارج، کیونکہ یہ سب چیزیں جسمانی عوارض سے مربوط ہیں اس لحاظ سے مخلوقات نہ خدا کے داخل اور نہ خارج ہیں اور نہ خدا عین مخلوقات ہے، کیونکہ وہ پروردگار ہے اور مخلوقات اس کی پیدا کی گئی ہیں اور پروردگار غیر از مخلوق ہے اور خدا کے وجود کا لا محدود ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ کسی بھی قید و شرط کے بغیر اور ہر فرض و قدرت میں موجود ہے۔ خدا کا مخلوق کے ساتھ ہونے کا معنی اس کے علم، قدرت اور مشیت کا مخلوق پر احاطہ ہے، نہ قرب مکانی ...

نبوت پر امامت کی برتری کا معیار

سوال: مقام امامت کو رسالت اور نبوت پر کیا فضیلت حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت ابرھیم علیہ السلام پر منت رکھتا ہے کہ امتحان کے ختم ہونے پر انھیں امام قرار دیا؟ اور اگر مقام امامت نبوت سے برتر ہے تو حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام، مسلمانوں کے اتفاق نظر کے مطابق کیسے مفضول اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاضل ہیں؟ مختصر یہ کہ ''امامت'' کی ''نبوت'' پر برتری کو بیان فرمایئے؟

جواب: خدائے متعال نے یہ جملہ: (...انی جاعلک للناس اماماً...) (بقرہ، ۱۲۴(

''ہم تم کو لوگوں کا امام اور قائد بنارہے ہیں''

اس وقت حضرت ابراھیم علیہ السلام کو فرمایا جبکہ وہ مسلّم نبی، رسول اور اولوالعزم نبیوں میں سے صاحب شریعت اور صاحب کتاب تھے مزید قدرتی طور پر نبوّت ورسالت کے ہمراہ ہدایت ودعوت کی ذمہ داری بھی رکھتے تھے اور خدائے متعال نے چند جگھوں پر اپنے کلام میں امام کی توصیف میں فرمایا: (...ائمۃ یھدون بأمرنا...) (انبیاء، ۷۳(

...''پیشوا قرار دیا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں''

اور ہدایت کی صفت کو ''امام'' کا معرّف قرار دیا ہے۔

یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ امام کی ہدایت، نبی کی ہدایت کے علاوہ ہے اور مسلّم طور پر نبی کی ہدایت دعوت اور تبلیغ ہے اور ہدایت کی اصطلاح راستہ دکھانے اور راہنمائی کرنے کا معنی ہے۔ اس لئے ہدایت کو امام میں مطلوب تک پہنچانے کے معنی میں لینا چاہئے۔ پس امام، چونکہ معارف اور احکام کو بیان کرنے کی ذمہ داری رکھتا ہے اور اعمال کو ادارہ کرنے کی مسؤلیت بھی رکھتا ہے، اور اشخاص کی باطنی نشو ونما، اعمال کو خدا کی طرف ہدایت کرنا اور انھیں مقاصد تک پہنچانا بھی امام کا کام ہے۔ چنانچہ لوگوں کے اعمال امام کے سامنے پیش کرنے، ہر شخص کے موت کے وقت امام کے پہنچنے، قیامت کے دن لوگوں کو اپنے امام کے ساتھ بلانے، نامہ اعمال کی تقسیم اور حساب کا امام کی طرف رجوع سے متعلق روایتیں اس مطلب کی دلالت کرتی ہیں۔

شیعوں کے عقیدہ کے مطابق، زمین کسی بھی وقت امام سے خالی نہیں ہوتی ہے اور اس لحاظ سے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی اور رسول ہونے کے علاوہ اپنے زمانہ میں امام بھی تھے اور نبوت، رسالت اور امامت کے نتیجہ میں حضرت علی علیہ السلام سے افضل ہیں، چنانچہ امت کا اجماع واتفاق بھی اسی کی دلالت کرتا ہے۔

خدائے متعال، خالق موجودات

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں: تمام موجودات اور ہستی نے خدائے متعال سے سر چشمہ لیا ہے، لہذا کلی طور پر سب مخلوقات خدا کی وحدت وجود کے زمینہ میں ہیں، لیکن ہم ہستی کو مختلف صورتوں میں پاتے ہیں، مثلاً بعض کو درخت، پتھر آدم وغیرہ کی صورت میں دیکھتے ہیں، اس مسئلہ کے بارے میں آپ کا جواب کیا ہے؟

جواب: جو برہان واستدلال کائنات کے لئے خدا کو ثابت کرتے ہیں، وہ کائنات کو خدا کا "فعل" اور خدا کو کائنات کا "فاعل" کے طور پر تعارف کراتے ہیں اور بدیہی ہے کہ فعل فاعل کے علاوہ ہونا چاہئے اور اگر فعل عین فاعل ہو تو، شئے "فاعل" اپنے وجود "فعل" سے پہلے موجود ہونی چاہے، لہذا کائنات خدا کے علاوہ ہے اور اس بناء پر یہ جو کہا گیا ہے: "کلی طور پر سب چیزیں خدا کی وحدت وجود کے زمینہ میں ہیں"... غلط ہے

کیا مخلوقات، وہم وخیال ہیں؟

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم دیکھتے اور تصور کرتے ہیں جیسے: پتھر، درخت اور انسان، یہ سب وہم وگمان ہیں بلکہ خود ہمارا وجود بھی ایک خیال ہے، مہربانی کر کے اس سوال کا جواب بیان فرمائیے۔

جواب: جو یہ کہتا ہے: جو کچھ ہم دیکھتے یا تصور کرتے ہیں وہ وہم وخیال ہیں اگر وہ اس بات کو سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے، تو اس کے بقول، خود اس کی یہ بات کہ "سب چیزیں خیال ہیں" وہم وخیال ہے اور اس کی کوئی قدر ومنزلت نہیں ہے اور اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا ہے۔

جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں انھیں سوفسطائی کہا جاتا ہے یہ لوگ یا تو نفسیاتی بیمار ہیں یا بدنیتی کی بنا پر مغالطہ کرتے ہیں ورنہ جس انسان کی فکر صحیح وسالم ہو اور بدنیتی بھی نہ رکھتا ہو اور کائنات کی خلقت کے بارے میں حقیقت پسند ہو تو وہ حقیقت کا قائل ہوگا۔ یہی کائنات کو وہم وخیال جاننے والے لوگ اپنے لئے اچھی زندگی کو ترتیب دے کر بھوک کے وقت روٹی کے پیچھے دوڑتے ہیں اور پیاس کے وقت پانی کی تلاش کرتے ہیں اور اس وقت یہ نہیں کہتے ہیں کہ روٹی اور پانی وہم وخیال ہے۔

سوال: فرض کریں اگر یہ سب خیال نہ ہو، تو خدا ان سب کے اندر داخل ہوا ہے!

آپ کا جواب کیا ہوگا؟

جواب: جس طرح پہلے سوال کے جواب میں بتایا گیا ہے یہ بات بھی استدلال کے خلاف ہے اور کوئی منطقی دلیل نہیں رکھتی ہے۔

ذات باری تعالے کا کنہ کیا ہے؟

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں: ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ذات خدا کی کنہ اور اصلی خود ہم ہیں اور یہ عبارت: "خدا نے ہمیں عدم سے وجود میں لایا ہے" کوئی مفہوم ودلیل نہیں رکھتی، اصلاً پورا وجود صرف وہی ہے اور اس کی دوسری کوئی صورت نہیں ہے اگر چہ ہم اشیاء کو ظاہری طور پر متنوّع اور متغیّر دیکھتے ہیں؟ آپ کا جواب کیا ہے؟

جواب: یہ بات بھی ایک بے دلیل بات اور فاقد برہان دعویٰ ہے۔ایسے لوگوں کا فہم جو بھی ہوانہی کے لئے حجت ہے دوسروں کے لئے نہیں اور دلیل کے بغیر دعویٰ کی کوئی قیمت واہمیت نہیں ہے۔

ہوالاوّل والآخر کے بارے میں صوفیوں کا نظریہ سوال: صوفی کہتے ہیں: سورہ حدید میں ''ھوالاول والآخر'' کا مقصود حضرت علی علیہ السلام ہیں، چنانچہ مرحوم علامہ مجلسی نے بھی بحارالانور کی آٹھویں جلد میں ایسا ہی نقل کیا ہے اور یہی زمینہ اشتباہات کو وسیع تر کرتا ہے۔اس بناپر اگر ہم مذکورہ دعویٰ کو جھٹلا دیں تو ہم نے علامہ مجلسی کی بات کو رد کیا ہے، کیونکہ خدا کی طرف پلٹنے والے ضمائر قرآن مجید میں بہت ہیں، مثلاً:

...)فھویھدین)(شعراء،۷۸(

...)فھویشفین)(شعراء،۸۰(

)وھوالذی فیالسّماءالٰہ وفی الارض الٰہ وھوالحکیم العلیم)(زخرف،۶۴(

...)ھوالعلیّ الکبیر)(حج،۶۲(

...)الحیّ الذی لایموت...)(فرقان،۵۸(

اوراس طرح کے ضمائر قرآن مجید میں بسیار ہیں، ہم کیسے سمجھ لیں گے کہ ان ضمائر کا مرجع علی علیہ السلام نہیں ہوں گے جبکہ ان آیات کا سیاق، ان ضمائر کے مرجع کو خدا بتاتا ہے۔

جواب: جو کچھ روایت میں آیا ہے یہ ہے کہ علی علیہ السلام اول وآخر ہیں اور ایک دوسری روایت میں نقل ہوا ہے کہ علی علیہ السلام کے اول وآخر ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے اور آخری شخص ہیں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدا ہوئے اور یہ وہ وقت تھا جب آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسد اطہر کو قبر شریف میں رکھ کر باہر آئے۔

سورہ حدید کے اول کے بارے میں ظاہر سیاق یہ بتاتا ہے کہ ''اوّل'' سے مراد وہ ہے جس کا وجود عدم سے مسبوق نہ ہو اور ''آخر'' سے مراد یہ ہے کہ جس کا وجود عدم سے ملحق نہ ہو اور وہ خدائے متعال ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

)وانّ الی ربّک المنتھیٰ)(نجم،۴۲(

''اور بیشک سب کی آخری منزل پروردگار کی بارگاہ ہے''

ممکنات کی نسبت علیّت واجب

استاد اکبر، میزان المفسرین، علامہ طباطبائی دام بقاء

عرض خدمت ہے کہ '' المیزان'' کی پندرھویں جلد کے صفحہ نمبر ۱۴۹اور ۱۵۰پر ''فلسفی بحث'' کے عنوان سے، بعض مسائل بیان ہوئے ہیں جن کی وجہ سے حقیر کے ذہن میں مندرجہ ذیل سوال پیدا ہوا:

سوال: واجب تعالیٰ کے ''جزءالعلۃ'' ہونے کا معنی کیسے تصور کیا جاسکتا ہے جبکہ قرآن مجید فرماتا ہے:

...)لیس کمثلہ شیء...)(شوریٰ،۱۱(

''اس کا جیسا کوئی نہیں ہے''....

جواب: السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

"المیزان" کی پندرھویں جلد طبع تہران کے صفحہ ۱۴۹اور ۱۵۰پر کی گئی فلسفی بحث کے بارے میں آپ کا خط ملا۔ اس میں واجب تعالی کی علیّت کے ممکنات کے بارے میں دو مختلف نظریہ بیان کئے گئے ہیں کہ پہلے نظریہ کے مطابق، واجب تعالی علت تامہ کا جزاور دوسرے نظریہ کے اقتضا کے مطابق علت تامہ قرار پایا ہے۔

یہ دو صورتیں آپس میں متقابل اور متنافی نہیں ہیں جس طرح عام طور پر تصور کیا جاتا ہے بلکہ دوسری صورت پہلی صورت سے دقیق تر اور مکمل تر ہے۔

انسان ابتدائی نظریہ میں ایک ضروری ادراک سے، ممکنہ موجودات میں کثرت اور مغایرت کو درک کرتا ہے اور اس کے بعد اس کثرت کے آحاد میں وجودی وابستگی کو درک کرتا ہے جو عمومی علیّت و معلولیت کے قانون کی بنیاد ہے اور اس کی وجہ سے ہر ممکن الوجود موجود علّت کی ضرورت ہے اور اس کی علّت بھی اگر ممکن الوجود ہو تو دوسری علّت چاہتا ہے یہاں تک کہ ایک ایسی علّت تک پہنچے جو ذاتاً واجب الوجود ہو اور علّت سے بے نیاز ہو، بلکہ تمام ممکن علتیں بلا واسطہ (مثل صدر اول) یا بالواسطہ (مثل باقی ممکنات) اس کی معلول ہیں، اگرچہ علّت قریب اور مباشر کے معنی میں یہ علّت تامہ اور علّت فاعلی کا جزء بھی ہے۔

یہ ہے پہلے اور ابتدائی نظریہ کے لحاظ سے اور دوسرے نظریہ کے مطابق ممکنات میں حکم فرما اوساط علّیت اور توقف وجودی کی بناپر، ممکنات کا پورا مجموعہ واحد ہوتا ہے جس کی علت تامہ واجب تعالیٰ ہے اور ممکنات میں سے ہر ایک کا ایجاد ان سب کی ایجاد ہے، جیسے، تفسیر میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

البتہ واضح ہے کہ دوسرا نظریہ پہلے نظریہ کی بنیاد پر مستحکم ہے، کیونکہ پہلے نظریہ کے باطل ہونے کی صورت میں قانون علت و معلول کا باطل ہونا لازم ہو گا اور نتیجہ کے طور پر اثبات صانع کا طریقہ بالکل بند ہو گا۔ واجب تعالی کو علت کا جزء شمار کرنا آئیہ کریمہ: (لیس کمثلہ شی) کے منافی نہیں ہے، کیونکہ علّت کی صداقت اور غیر واجب تعالی کا سبب، جب فیض کے واسطہ سے اور واجب تعالی کا جعل ہو تو، امکانی علل کو واجب کے مثل۔ جبکہ اس کی علّیت ذاتی واستقلال کی صورت میں ہو۔ نہیں بناتا ہے۔ چنانچہ سائر صفات کمال مانند، حیّ، عالم، قادر، سمیع، بصیر وغیرہ کی صداقت غیر واجب کی شرکت کی مستلزم نہیں ہے، کیونکہ ممکن میں موجودہ صفت کمالی جعل اور اضافہ واجب پر منحصر ہے اور مستقل نہیں ہے، اس کے برخلاف واجب تعالی اپنی صفات کمال میں ذاتی طور پر مستقل اور دوسرے سے بے نیاز ہے۔

اسی طرح آیہ کریمہ: (... ھل من خالق غیر اللہ) (فاطر،۳) کے منافی نہیں ہے اور آیہ کریمہ میں خالق سے مراد خالقیت سے مستقل خالق ہے جو خالقیت کی توصیف میں دوسروں کا محتاج نہ ہو، کیونکہ قرآن مجید کی آیتیں خدا کے علاوہ دوسرے خالقوں کو ثابت کرتی ہیں:

) فتبارک اللہ احسن الخالقین)(مؤمنون،۱۴(

...)واذ تخلق من الطین کھیئتہ الطیر باذني فتنفخ فیھا فتکون طیراً باذني) (۳مائدہ،۱۱۰(

اور اس سیاق کے بارے میں موجود دوسری آیات۔

اس کے علاوہ قرآن مجید بہت سی آیات میں عمومی علیّت کے قانون کی تصدیق فرماتا ہے، جیسے:

...)وبدا خلق الانسن من طین ۰ ثم جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مھین) (سجدہ،۷۔۸(

..."اور انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا ہے۔ اس کے بعد اس کی نسل کو ایک ذلیل پانی سے قرار دیا ہے۔"

اور:

...)الذی خلقکم من نفس واحدۃٍ و خلق منھا زوجھا و بثّ منھما رجالا کثیراًونساء...)(نساء ۱(

...''جس نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کا جوڑا بھی اس کی جنس سے پیدا کیا ہے اور پھر دونوں سے بکثرت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دئے ہیں''

یہ تصدیق مادی ہے اور مطلقاً ممکنات سے علیّت کی نفی اور واجب تعالی سے اس کا حصر اشاعرہ سے منسوب ہے کہ اس کے ثبوت کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

آپ کی خدمت میں سلام واخلاص کے ساتھ اپنے عرائض کو خاتمہ بخشتا ہوں۔

عدم زمانی سے مسبوق مادہ کی پیدائش

سوال: مادہ کی ازلیّت ذاتی اور ذاتی طور پر سابقہ ہونے کو کس دلیل سے نفی کیا جاسکتا ہے؟

جواب: ذاتی ازلیّت اور ذاتی خدمت کی اصطلاح ایسی جگہ پر استعمال ہوتی ہے جہاں شئے کی ذات عین ہستی وجود ہو اور ایسی چیز محال ہے کہ عدم اسے قبول کرے اور نتیجہ کے طور پر شئے اپنے صفات اور حالات میں کسی قسم کی تغیر قبول نہیں کرے گی، اور بدیہی ہے کہ ماڈہ ایسا نہیں ہے۔ لیکن ظاہراً سوال میں ذاتی ازلیّت اور ذاتی خدمت وہی زمانہ کے لحاظ سے قدیم ہے اور سوال یہ ہے کہ کیا مادہ (ایٹم) اپنی پیدائش میں مسبوق بہ عدم زمانی ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب مثبت ہے، کیونکہ علوم مادی کے نظریہ کے مطابق، ایٹم انرژی میں تبدیل ہونے اور برعکس کی قابلیت رکھتا ہے اور ہر ایٹم انرجی کے دبے ہوئے ذرّات کا ایک مجموعہ ہے جو ایٹم کو تشکیل دیتے ہیں اور اسے وجود میں لاتے ہیں اور قہراً ایٹم مسبوق بہ عدم ہوتا ہے اور اس صورت میں، ایٹم اور انرژی کے درمیان ایک مشترک ماڈہ فرض کیا جانا چاہئے جس کی خاصیت صرف صورت وفعلیّت کو قبول کرنا ہو گی اور اس بناءپر، یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ: فعلیّت کو انجام دینے والا (صورت فاعل اور فعلیّت) فرض ماڈہ ہے بلکہ یہ ایک ماورائے مادہ امر ہے اور مادہ اس فعلیت کے سایہ میں، فعلیّت اور تحقق پاتا ہے، لہذا ہستی کا مشہود عالم، ایک ایسے فاعل کا فعل ہے جو ازلی اور ثابت ورائے عالم ہے اور وہ خدائے متعال ہے۔

ظلم کا وجود کیوں ہے؟

سوال: سلام علیکم، آپ کا خط ملا، امید رکھتا ہوں آپ اس علمی جدوجہد میں کامیاب رہیں گے۔

آپ نے مرقوم فرمایا تھا:

''جس دنیا میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، اس میں چاروں طرف ظلم پھیلا ہوا ہے۔ انسان اور حیوان سے جس قدر ممکن ہو سکتا ہے مظلوم کو زدوکوب کرتے ہیں یا بعض افراد ظالم کے بغیر بھی مظلوم ہیں، جیسے ایک بچے کا بیمار ہونا۔ ہم ایک حیوان کو دیکھتے ہیں کہ کسی گناہ کے بغیر اپنے سے قوی تر حیوان کا شکار ہوا ہے اور اس کے ذریعہ بدترین صورت میں جان دیتا ہے''۔

جواب: بحث میں داخل ہونے سے پہلے تمہید کے طور پر جاننا چاہئے کہ خلقت کی بنیاد علیّت و معلولیّت پر ہے اور ماڈی دنیا ایک ناقابل استثنا اصول کی بنا پر ادارہ ہوتا ہے نہ کہ جذبات اور احساسات پر، مثلاً آگ کی خاصیت جلانا ہے خواہ کسی پیغمبر کا دامن ہو یا کسی ظالم کا لباس۔ درندہ حیوانات اور شکاری پرندے گوشت خواہیں جو اگر گوشت نہ کھائیں تو مر جائیں گے اور یہ حق انہیں تخلیق سے ہی بدن کی ساخت اور بناوٹ کے مطابق دیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں کسی قسم کی ذمہ دراری نہیں رکھتے، چنانچہ انسان بھی حیوانوں کے گوشت سے تغذیہ ہوتا ہے اور نفسیاتی طور پر کسی قسم کی مسؤلیت کا احساس نہیں کرتا ہے۔

مذ کورہ بیان کے مطابق، ظلم (دوسروں کے حق پر تجاوز کرنے یا قوانین کے نفاذ میں امتیاز برتنے کے معنی میں) انسانی معاشرہ سے باہر وجود نہیں رکھتا ہے اور جن ناخوشگوار حوادث کا مشاہدہ ہوتا ہے انہیں ظلم نہیں کہنا چاہئے بلکہ یہ ایسے " شرور" ہیں جو اپنی پیدائش کی علّت کی نسبت "خیر" ہوتے ہیں اور عمل کے موقع کی نسبت سے شر اور علّت، اپنے وجودی اقتضا کے مطابق اپنی کارکردگی کا حق رکھتے ہیں۔ایک چھ مہینے کے بچہ کی بیماری ظلم نہیں ہے بلکہ شر اور ایک محرومیت ہے جو اسباب کی پیدائش کے نتیجہ میں بیماری کی صورت میں پیدا ہوئی ہے، بلی جو کتّے کے پنجوں میں پھنس کرنا گوشگوار حالت سے دوچار ہوتی ہے، وہ شر ہے نہ کہ ظلم اور یہی بلی چوہے کے بارے میں یہی عمل انجام دیتی ہے اور اسے جائز جانتی ہے۔

جی ہاں ! انسان اپنی زندگی کی فعالیت کو اپنی نفسانی خواہشات کے سایہ میں جذبات کی بناء پر اختیاری طور پر انجام دیتا ہے، اسی وجہ سے وہ اپنی زندگی میں بے شمار اور گوناگوں نیاز مندیاں رکھتا ہے اور تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا، اس لئے وہ اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے اور فطری طور پر اپنے اجتماع کو استحکام بخشنے کے لئے اس نے کچھ واجب الاطاعت قوانین کو قبول کیا ہے، جن کی رو سے معاشرہ کے ہر فرد کے منافع کا، اجتماعی توازن کے مطابق، تحفظ کیا گیا ہے اور اس کے واجب الاطاعت حقوق ثبت کئے گئے ہیں، کہ قوانین کے مطابق ان کا تحفظ ضروری اور ان قوانین کی خلاف ورزی ممنوع ہے۔ان ہی وضعی اور قرار دادی حقوق کی پائمالی کو ظلم کہا جاتا ہے اور اسے جرم شمار کیا گیا ہے۔اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی شخص ناحق طور پر کسی کے ثابت حق پر جارحیت کر کے اسے پائمال کرے۔

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کے اجتماعی ماحول سے باہر ظلم کا کوئی مصداق نہیں ہے اور بہر حال ظالم کو ظلم کرنے کا حق نہیں ہونا چاہئے۔اس بناء پر تکوینی علّتوں کے ناخوشگوار اثرات، جنھیں خلقت نے مجہز کر کے حق دیا ہے، شرّ ہیں نہ ظلم۔اور اسی طرح جب انسان ایک اہم تر حق کے لئے کسی غیر اہم حق کو پائمال کرتا ہے وہ بھی شر ہے نہ ظلم اور اسی طرح ظلم کے مقابلہ میں ظالم سے لئے جانے والا قصاص ظالم کے لئے شرّ ہے نہ ظلم۔

...)فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم...)(بقرہ ۱۹۴(

..."لہذا جو تم پر زیادتی کرے تم بھی ویسا ہی برتاؤ کرو جیسی زیادتی اس نے کی ہے"...

اسی طرح خدا سے نسبت دی جانے والی مصیبتیں اور ناخوشگوار حوادث بھی ایسے ہی ہیں، ان کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔

آپ نے لکھا تھا: ایک صاحب کہتا تھا: جب ایک چھوٹے حیوان کو ایک قوی اور بڑا حیوان کھاتا ہے، تو بڑا حیوان ارتقاء پیدا کرتا ہے (یعنی کمزور حیوان کا گوشت بڑے حیوان کا جزو بن کر اسے مکمل تر کرتا ہے) بلی کا گوشت کتّے کا جزو بننا کونسا ارتقاء ہے ؟

یہ بیان، نظری ہے فلسفی اور صحیح اور یہ نظریہ "حرکت جوہری" کے فروعات میں سے ہے، لیکن چونکہ یہ مسئلہ فنّی اور وسیع ہے، اس کو ایک یاد و خطوط میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔

آپ نے مرقوم فرمایا تھا: "کہتے ہیں تمام چیزوں کا مالک خدا ہے سب اسی کی ملکیت ہے، وہ خود جانتا ہے، میں بھی جانتا ہوں کہ وہ خود جانتا ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قرآن مجید واضح طور پر فرماتا ہے کہ خدا ہر گز ظلم نہیں کرتا ہے"

اس مطلب کا صحیح بیان یہ ہے کہ عالم خلقت میں جو کچھ ہے اور فرض کیا جانے والا ہر کمال، پروردگار عالم کی مطلق ملکیت ہے، جزئی سے لے کر کلی تک اس کا تحفہ اور بخشش ہے، اس کے بغیر کہ کسی بھی مخلوق کا استحقاق کی راہ سے خدا پر کوئی حق ہو جو اسے عطیہ و بخشش کے لئے مجبور کرے اور نہ کسی ایسی علت کے بارے میں فرض کیا جا سکتا ہے جس نے خدائے متعال پر اثر ڈال کر اسے کسی کام کو انجام دینے یا ترک کرنے پر مجبور کیا ہو اور جس حق کا بھی فرض کیا

جائے اس کو جعل کرنے والا اور مالک خدا ہے، اسی طرح خدا کی طرف سے کسی بھی مخلوق کو پہنچنے والی ہر مصیبت اور ناخوشگواری خدا کا حق ہے اور وہ مخلوق اس سلسلہ میں خدا پر کوئی حق نہیں رکھتی:

...)ویفعل اللہ مایشاء)(ابراھیم ۲۷(

..''اور وہ جو بھی چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔''

لہذا اصولی طور پر وہ امر ظلم نہیں ہوگا نہ یہ کہ وہ ظلم ہے اور خدا سے ظلم قابل مذمت نہیں ہے۔ منتہی یہ کہ خدا کی نعمت وعطیہ ایک ایسی رحمت ہے جسے خدا نازل فرماتا ہے اور عذاب ومصیبت، رحمت نازل نہ کرنا ہے جو امر عدمی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

)مایفتح اللہ من رحمۃ فلا ممسک لھا ومایمسک فلا مرسل لہ من بعدہ..)(فاطر ۲(

''اللہ انسانوں کے لئے جو رحمت کا دروازہ کھول دے، اس کا کوئی روکنے والا نہیں ہے اور جس کو روک دے اس کا کوئی بھیجنے والا نہیں ہے۔''

بعض اوقات انسان کا ظلم اس کی اولاد میں منعکس ہو کر ظاہر ہوتا ہے، لیکن اس صورت میں بچہ کی مصیبت وہی اس کے باپ کا ظلم ہے نہ باپ کے ظلم کی سزا۔ لیکن قیامت کے دن گرفتار ہوئے حیوانات کی پاداش کے بارے میں قرآن مجید کے مطابق حیوانات کے لئے بھی روز محشر ہے:

)ومامن دابّۃ فی الأرض ولاطیر یطیر بجناحیہ الّاامم امثالکم مافرّطنا فی الکتٰب من شیٍ ثم الی ربّھم یحشرون)(انعام ۳۸(

''اور زمین میں کوئی بھی رینگنے والا یا دونوں پروں سے پرواز کرنے والا طائر ایسا نہیں ہے جو اپنی جگہ پر تمہاری طرح کی جماعت نہ رکھتا ہو۔ ہم نے کتاب میں کسی شے کے بارے میں کوئی کمی نہیں کی ہے اس کے بعد سب اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔''

لیکن ان کے روز قیامت کے بارے میں تفصیلات بیان نہیں ہوئے ہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ خدائے متعال قیامت کے دن سینگ رکھنے والے حیوانوں سے بغیر سینگ والے حیوانوں کا قصاص لے گا۔ کلی طور پر کتاب وسنت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات اور اس میں جاری نظام میں کوئی بھی واقعہ مصلحت کے بغیر نہیں ہے خواہ ہم جانیں یا نہ جانیں۔ آپ نے لکھا تھا: میرے عرائض اور ناراحتی کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ دنیا میں ظلم ہے اور اکثر قصاص بھی نہیں ہوتا۔

۲۔ کہیں قیامت کے دن بھی ایسا ہی نہ ہو اور ان (حیوانات) کے لئے، جو مظلوم واقع ہوتے ہیں، قیامت کے دن کوئی جزا نہ ہو۔ ظلم کیوں ہوتا ہے، جبکہ اول سے ہی ظلم ایک غلط کام ہے؟

لیکن آپ نے جو یہ فرمایا ہے: ''اکثر ظلم میں قصاص نہیں ہوتا ہے'' حقیقت میں اکثر جس کو آپ نے ظلم کہا ہے، وہ شر ہے نہ ظلم اور قصاص ظلم میں ہوتا ہے نہ مطلق شر میں۔ شرور کے بارے میں کوئی مصلحت اور حکمت ہے۔ نظام خلقت کے بارے میں عموماً یا خصوصاً اور جن مواقع میں واقعاً ظلم ہوتا ہے اور کوئی حق پائمال ہوتا ہے اگر اس کا دنیا میں قصاص ہوا تو بہتر اور اگر دنیا میں قصاص نہ ہوا تو خدا کے واضح وعدوں کے مطابق آخرت میں ضرور ہوگا:

)ان اللہ لایخلف المیعاد)(رعد ۳۱(

''بیشک اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا ہے۔''

لیکن یہ کہ مظلوم حیوانات کے لئے قیامت کے دن جزا ہے یا نہیں؟ خدائے متعال نے آخرت کا (یوم الدین)(حمد ۴) روز جزا نام رکھا ہے اور حیوانات کے روز محشر کے بارے میں واضح طور پر ذکر فرمایا ہے اس کا ضروری پاداش ہوگا، لیکن یہ کیسے انجام پائے گا ہمارے لئے بیان نہیں فرمایا ہے، اسی قدر فرمایا

ہے:

...)لاظلم الیوم) (...غافر،۱۷(

...''آج کسی طرح کا ظلم نہ ہو سکے گا۔''

انسان کی شخصیت اور قیامت کا دن

سوال: سائنس کے مطابق اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مرنے اور دفن ہونے کے بعد انسان کا بدن بعض عوامل کے تحت نائٹریٹ اور نائٹروجن میں تبدیل ہوتا ہے، اس میں سے ایک حصہ مٹی میں جذب ہوتا ہے، اور زراعت کے بعد یہی مواد کاشت کی گئی چیزوں میں جذب ہوتا ہے اور انسانوں کے ذریعہ انھیں استعمال کرنے کے بعد، یہی مواد زندہ انسانوں کے نشو و نما کا سبب بنتا ہے اور اس طرح ایک نئے انسان کے بدن کے خلیوں کی بناوٹ کا سبب بنتا ہے۔

قیامت کے دن انسان کے دوبارہ زندہ ہونے کی صورت میں، پہلے انسان کے بدن کو بنانے میں اس کے مواد کو کیسے پورا کیا جائے گا؟ اگر اسے اپنے پہلے مواد سے مکمل کیا جائے تو، دوسرے شخص کا بدن نقص سے دوچار ہو جائے گا، اگر مکمل نہ ہو جائے تو پہلے شخص کا بدن نامکمل رہے گا!

جواب: سائنسی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ انسان کے بدن کے اجزاء اس کی پوری عمر کے دوران تجزیہ و تغیرات کے نتیجہ میں ہر چند سال کے بعد ایک بار سر تا پا مکمل طور پر تبدیل ہو کر پہلے اجزاء کی جگہ لیتے ہیں و راس کے باوجود یہ شخص بالکل وہی سابقہ انسان ہوتا ہے اور اس کے بدن کے اجزاء کا بدل جانا اس کی شخصیت کے بدلنے میں کوئی اثر نہیں ڈالتا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کم و بیش پچاس، ساٹھ سال عمر کرنے کے بعد واضح طور پر مشاہدہ کرتا ہے کہ وہی انسان ہے جو کبھی بچہ تھا، کبھی جوان اور اب بوڑھا ہو چکا ہے، اور جس حقیقت کا وہ لفظ میں سے تعبیر کرتا ہے، ہم اسے ''نفس'' کہتے ہیں، اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ہے اور اپنی جگہ پر پائدار اور ثابت ہے اور اسی طرح جو شخص جن جرائم کو بچپن میں انجام دیتا ہے، ان کے مرتکب ہونے کی وجہ سے اسے بوڑھاپے میں سزا دی جاتی ہے۔

اس نظریہ کے مطابق انسان کی شخصیت اس کے نفس سے ہے نہ بدن سے انسان کے بدن کے مادّہ میں سے کچھ حصہ کے نابود ہونے سے، اسی نفس کے ساتھ تعلق کے فرض کی بناء پر انسان کی شخصیت تبدیل نہیں ہوتی اور اگر قیامت کے دن انسان کا نفس اس کے بدن کے تغیر یافتہ اور نابود ہوئے اجزاء میں سے جن اجزاء سے بھی تعلق پیدا کرے، یا ان میں کسی بھی قسم کی کمی ہو اور دوسرے اجزاء سے مکمل ہو جائے، تو انسان کا بدن وہی دنیا کا بدن ہو گا اور شخص انسان وہی دنیوی انسان ہو گا۔

محمد حسین طباطبائی

تیسرا حصہ:

خلقت اور قیامت کا مسئلہ

خلقت اور قیامت کا مسئلہ

خلقت کا مقصد کیا ہے؟

کچھ مجہولات ایسے ہیں جن کے وجود کے بارے میں انسان کو اپنی پیدائش اور زندگی کے ابتدائی دنوں سے اپنی خداداد عقل سے خواہ نخواہ معلوم ہوا ہے اور اپنے فطری تجسس سے ان کا حل طلب کرتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھتا ہے: کیا اس مشہود عالم ہستی کا پیدا کرنے والا کوئی خدا ہے؟ اس کے خالق ہونے کی صورت میں، اس خلقت سے اس کا مقصد کیا ہے؟ کیا اس صورت میں ہم پر کوئی فریضہ اور تکلیف عائد ہوتی ہے؟

بدیہی ہے کہ مذکورہ سوالات میں سے ہر ایک کا مثبت جواب ہوگا۔ سوال کے مشخصات، اس کے وجود کی کیفیت، آثار اور اس کے تحقق کی ضرورت کے بارے میں کچھ فرعی سوالات پیدا ہوں گے۔ جیسا کہ بیان ہوا۔ انسان کی خداداد فطرت، فکر مند ہے اور ان کے قطعی اور منطقی حل کی خواہاں ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ مورد سوال مسئلہ، ابتدائی ترین اور اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے جو انسانی فطرت کی توجہ کا سبب بنا ہے اور انسان کی فطرت اس کے قطعی اور منطقی حل کی ضرورت کو زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں درک کرتی ہے۔

سوال کی تحقیق اور اس کا تجزیہ

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ جو چیز ہمیں خلقت کے مقصد کے بارے میں سوال کرنے پر مجبور کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہم۔ چنانچہ مشاہدہ کرتے ہیں ۔اپنے اجتماعی اور عقلی کاموں کو اپنے ان مقاصد اور آرزوؤں کو حاصل کرنے کے لئے انجام دیتے ہیں، جو طبیعی طور پر مناسب ہوں اور ہمارے کام آئیں ۔ہم کھاتے ہیں، تاکہ سیر ہو جائیں، پانی پیتے ہیں تاکہ پیاس بجھے، لباس پہنتے ہیں تاکہ سردی ور گرمی سے اپنے بدن کو محفوظ رکھ سکیں، گھر بناتے ہیں تاکہ اس میں رہائش حاصل کریں، گفتگو کرتے ہیں تاکہ اپنے دل کی بات کو سمجھادیں...

انسان، بلکہ ہر ذی شعور، جو کام عقل وشعور سے انجام دیتا ہے، کبھی غرض اور مقصد کے بغیر نہیں ہوتا ہے اور جس کام کا کوئی فائدہ نہ ہو، اسے انجام نہیں

دیتاہے ہمارے ارادی افعال میں اسی مقصد کامشاہدہ اور ہر فاعل کی حالت کے بارے میں اس کا قیاس، ہماری حالت کے لئے ایک اور علم ہے جو ہمیں یہ پوچھنے پر مجبور کرتاہے: ''خالق کائنات (جو ایک علمی فاعل کامصداق ہے) کا خلقت سے کیا مقصد ہے؟'' لیکن کیا مشاہدہ کا یہی اندازہ اور قیاس اس سوال کے صحیح ہونے کی ضمانت دے سکتاہے؟ اور کیا بعض موارد میں پائے گئے حکم اور خاصیت سے تمام موارد کو وسعت اور عمومیت دی جاسکتی ہے؟ ان سوالات کا جواب منفی ہے اور تنہا راہ حل مقصد کے معنی کا قطعی تجزیہ و تحقیق ہے، کیونکہ استحکام اور تحقیق کے لئے اور کوئی راستہ موجود نہیں ہے۔

تغذیہ کی مثال میں بیان ہوا کہ، سیر ہونے کا مقصد ہمیں تغذیہ کے ذریعہ حاصل ہوتاہے، سیری کا تغذیہ سے ایک رابطہ ہے، کیونکہ یہ اسی کام کا نتیجہ اور پیداوار ہے اور کھانا معدہ میں داخل ہونے کے ساتھ نظام ہاضمہ کو سر گرم کرتاہے اور اسے نئی غذا داخل کرنے سے بے نیاز کرتاہے اور اس کی چاہت کو پورا کرتاہے۔ بہر حال ''سیری'' تغذیہ کی ایک قسم کا اثر اور معلول ہے اور تغذیہ بھی ایک مخصوص کام اور حرکت ہے جو ہم سے شروع ہو کر اپنے اثر یعنی ''سیری'' پر منتہیٰ ہو کر خود نابود ہوتاہے یہی تغذیہ ہمارے ساتھ (جو فاعل ہیں) ایک اور رابطہ رکھتاہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنے وجود کے اندر اپنی بقاء اور زندگی کو جاری رکھنے کے لئے ذخیرہ کے طور پر کوئی مواد نہیں رکھتے ہیں، بلکہ صرف اپنی بقاء کے تحفظ کے لئے بعض سلاح، مسائل اور توانائیوں سے مسلح ہیں جن کے ذریعہ بقاء کے لئے مفید غذائیں تدریجاً حاصل کر کے انھیں اپنے وجود سے ملا کر اپنی زندگی کو جاری رکھتے ہیں۔

یہی ہماری اندرونی توانائیاں، جو عقل و شعور کی اٹوٹ انگ ہیں، نیاز مندی کا احساس کر کے اپنے فطری جوش وجذبہ سے ہمیں اپنے بدن کے وسائل اور توانائیوں کو سر گرم کرنے پر مجبور کرتی ہیں تاکہ ہم اپنی خاص حرکتوں کو انجام دے کر ضروری غذا اور مواد تک پہنچ جائیں اور اپنے وجود کی کمیوں کو پورا کریں۔ پس ''سیری'' جس کا تغذیہ سے ایک رابطہ تھا، ہمارے ساتھ بھی ایک رابطہ رکھتی ہے، کیونکہ یہ ایک کمال ہے جو ہمارے وجود کی کمی اور ہماری ضروریات کو پورا کرتاہے اور ہماری اندرونی توانائیوں کے ساتھ جو ظہور کرتاہے، وہ ہمیں اسے حاصل کرنے اور اپنے آپ کو اس سے مکمل کرنے پر مجبور کرتاہے۔

اگر ہم اپنی بے شمار ارادی اور اختیاری سر گرمیوں، جیسے: کھانے، پینے، اٹھنے بیٹھنے، باتیں کرنے، سننے اور آنے جانے.... کی تحقیق کریں، تو وہی خاصیتیں حاصل ہوں گی جو تغذیہ کی مثال کی تحقیق سے حاصل ہوئیں۔ حتی اگر ہم ظاہراً بالکل بے غرضی میں انجام دینے والے کاموں پر توجہ کریں، تو واضح ہوگا کہ اگر اس کام میں کوئی منافع نہ ہو تو ہم اسے انجام نہیں دیں گے، جیسے، صرف انسان دوستی کی وجہ سے انجام دی جانے والی نیکیاں جن میں اور کوئی مقصد نہیں ہوتاہے اور مدد کے مانند کہ ایک بے نیاز دولت مند، ایک محتاج فقیر کی مدد کرتاہے اور....ان مواقع پر ہم حقیقت میں اپنے جذباتی آرزوؤں کو عملی جامہ پہناتے ہیں اور فقیر کی حالت کا مشاہدہ کرتے ہوئے اپنے اندرونی جذبات کو پورا کر کے اپنے نفس کو مطمئن کرتے ہیں اور اسی طرح...

اس تحقیق سے عام اور کلی طور پر یہ نتیجہ حاصل کیا جاسکتاہے کہ اختیاری کاموں میں ''فعل کا مقصد'' ایک مناسب اثر ہے جو فعل کے آخر (فاعل کی مخصوص حرکت) میں قرار پایاہے اور یہ فعل کی سر حد ہے اور یہ کمال ہے جو فاعل کے نقص کو دور کر کے اسے مکمل کرتاہے۔

البتہ۔ جیسا کہ واضح ہوا۔ ہم موضوع کی ابتداء میں غرض اور مقصد کو اختیاری فاعلوں۔ جو عقل و شعور سے مسلح ہوں۔ سے مخصوص اور ان کے اختیاری کام جانتے ہیں لیکن اگر تھوڑا اور سنجیدہ ہو جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ جن تمام آثار اور خاصیتوں کو ہم نے ان کے ذریعہ افعال اور اختیاری فاعلوں یعنی ''غرض'' کے لئے ثابت کیا، کسی کمی بیشی کے بغیر طبیعی عاملوں اور ان کے طبیعی کاموں میں موجود ہیں کیونکہ ہر طبیعی عامل اور ہر مادی مرکب بھی ایک اختیاری فاعل کے مانند کچھ توانائیوں سے مسلح ہوتاہے جو ضرورت پوری کرنے اور اپنی طبیعت کے اقتضا کے لئے ان سے کام لیتاہے اور اپنی مخصوص

حرکت۔ جو اس کا عمل ہے۔ کو انجام دے کر اپنی ضرورت کو پورا اور اپنی کمی کو دور کرتا ہے، اور وہی چیز جو اس کی فعالیت کا اثر ہے بھی اس کی فعالیت کے ساتھ بھی بلاواسطہ اور منظم رابطہ رکھتی ہے اور خود اس کر ساتھ بھی۔ چنانچہ اختیاری فعالیتوں کے بارے میں بھی ایسا ہی تھا اور عقل وشعور کا نہ ہونا اس مقصد کے تحقق یا عدم تحقق اور اس کے فاعل سے رابطہ میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتا ہے۔

اگرچہ ہم اس موضوع کو افعال اختیاری کے بارے میں، جو زندہ اور باشعور فاعلوں کے ارادہ سے انجام پاتے ہیں، ''غرض'' نام رکھتے ہیں اور دوسرے طبیعی افعال میں ''غرض'' کے نام سے پرہیز کر کے اسے ''غایت'' کہتے ہیں اور لفظ ''غرض'' کے اطلاق کو مجازی اطلاق تصور کرتے ہیں، لیکن ان دونوں میں حقیقت امر ایک ہی ہے، اور جو کام ایک طبیعی عامل طبیعت کے تاریک خانہ میں انجام دیتا ہے اسی کام کو ایک زندہ فاعل علم کے چراغ کی روشنی میں انجام دیتا ہے، بغیر اس کے کہ مذکورہ رابطوں میں کوئی تبدیلی آئے۔

غرض اور آرزو کی عمومیت

مذکورہ بیان سے واضح ہوتا ہے کہ عالم خلقت کے تمام اجزاء میں ''غرض'' عمومیّت رکھتی ہے اور جہاں تک علیّت، معلولیت اور دیگر کلّی قوانین حکم فرما ہیں، ہر گز کوئی کام مقصد اور غرض کے بغیر انجام نہیں پاتا ہے اور کوئی عامل اپنی سرگرمی اور عمل میں غایت اور آرزو سے بے نیاز نہیں ہے۔

ہر نوع سے ایک فرد کو لے لیں، جیسے ایک انسان، ایک کیڑا، سیب کا ایک درخت، گندم کا ایک پودا، لوہے کا ایک ٹکڑا، آکسیجن کی ایک اکائی... ہم دیکھ لیں گے کہ یہ سب چیزیں اپنے اندر سرگرم توانائیوں کی موجودگی کے ذریعہ اپنے ارد گرد ماحول سے ہم آہنگ ہو کر اور اپنے ماحول کے سرگرم اجزاء سے ہم آہنگی کر کے اپنے ارتقائی مقاصد کو اپنے فائدہ میں حاصل کرنے کے لئے خصوصی حرکات انجام دیتے ہیں، جوں ہی یہ خصوصی حرکت تمام ہوتی ہے، حرکت کا نتیجہ ''غرض وغایت'' کی صورت میں حرکت کی جگہ لیتا ہے، اور متحرّک کی فطری آرزو پوری ہوتی ہے اور اس کا مطلوب کمال اس کے وجود سے ملحق ہو جاتا ہے۔

تمام انواع، جو دنیا کے گوشہ وکنار میں بڑے بڑے خاندان کو تشکیل دے کر زندگی کر رہے ہیں، جیسے: انسان کی نوع، گھوڑے کی نوع، سیب کے درخت کی نوع... کی بھی یہی حالت ہے اور ہمیشہ اپنی نوع کی خصوصی سرگرمی سے اپنے مقاصد اور آرزؤوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور انھیں حاصل کر کے اپنے تکوینی نواقص کو دور کر کے اپنی بقاء کے لئے مدد لیتے ہیں۔

کائنات کے تمام اجزاء۔ جن کے درمیان ناقابل انکار رابطہ موجود ہے۔ کے بارے میں بھی یہی حالت جاری ہے۔

بنیادی طور پر تحقّق پانے والی حرکت، ایک طرف سے دوسری طرف ہوتی ہے ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ہمیشہ واسطہ کی حالت میں ہوتی ہے اور ایک چیز کو دوسری چیز سے اور ایک طرف کو دوسری طرف سے ملاتی ہے، جس جہت اور طرف کو اس کی حرکت چاہتی ہے، وہی غرض اور غایت ہے، جو متحرک کی کمی اور اس کی چاہت کو پورا کرتی ہے، پھر اس حالت میں منقطع ہوتی ہے یعنی ایک ایسی حالت میں تبدیل ہوتی ہے جو اس کی نسبت آرام وسکون شمار ہوتا ہے، یہی آرام وسکون دوسری صورت میں دوسرے کی حرکت ہے جو خود بھی ایک دوسری غرض وغایت کی تلاش میں ہے۔

کبھی یہ تصور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کوئی حرکت محقق ہو جائے اور کسی طرف متوجہ نہ ہو یا کسی طرف متوجہ ہو لیکن مذکورہ ''طرف'' حرکت سے کوئی رابطہ نہ رکھتی ہو اور صرف اتفاق سے ظاہر ہوئی ہو یا کسی محرّک کی طاقت کوئی حرکت وجود میں لائی ہو لیکن اس حرکت سے علیّت کا رابطہ نہ ہو یا حرکت

کے ساتھ رابطہ ہونے کے باوجود قوۂ محرکہ کا ''حرکت کی غایت'' سے اتفاقی رابطہ ہو۔

علل وعوامل کی سرگرمی کے نتیجہ میں اس کائنات میں مشاہدہ ہونے والا عجیب وغریب نظم اور اس عالم ہستی میں یکساں طور پر حکم فرمانا قابل تغیر عمومی قوانین اتفاقی حدوث کو ناقابل قبول بناتے ہیں۔

بقول ایک دانشور ایک ایٹم کے صرف دس جزء سے ایک خاص ترکیب میں تشکیل پائی ایک چیز کا اتفاقی طور سے پیدا ہونے کا فرض، دس عرب فرضوں میں سے ایک فرض ہے، لیکن منہائے ایک، دس ارب فرضوں کے مقابلہ میں صرف ایک فرض کی پیروی کرنا ایک بیوقوفانہ اور بے بنیاد تصور کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

انسان کے علمی افکار اور فطری شعور ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتے کہ کائنات کی بے انتہا فعالیتوں میں فعل وفاعل اور غایت فعل کے رابطہ سے انکار کر کے تمام علمی فیصلوں اور ناقابل انکار انسانی افکار کی بیخ کنی کی جائے۔

کائنات کو خلق کرنے میں خدا کا مقصد

وسیع عالم خلقت، چھوٹے اور حقیر ذرّہ سے لے کر ایک عظیم ثابت اور متحرّک اجرام فلکی کے مجموعہ اور حیرت انگیز کہکشاں، آپس میں رکھنے والے حقیقی رابطہ کے ذریعہ ایک عظیم اکائی تشکیل دیتے ہیں جو اپنی تمام ہوّیت، حقیقت اور حیثیت کے ساتھ (نہ صرف اپنی مکانی نسبیت کے لحاظ سے) تغیر وتحول کی صورت میں ایک کلی اور عمومی حرکت کو وجود میں لاتے ہوئے (علمی وفلسفی نظریہ کے مطابق) ایک مقصد اور آرزو کی طرف گامزن ہیں (مذکورہ قطعی نظریہ کے مطابق) ان کے ایک مشترک

سرحد پر پہنچنے کے بعد، مذکورہ مقصد اور غرض، اس حرکت کا جانشین بن کر اس شور وغوغل سے بھری کائنات کو ایک ثابت وآرام عالم میں تبدیل کرتا ہے۔

ہماری آئندہ دنیا ایک آنے والے کل کی دنیا ہے، جو آج کی دنیا کے پیچھے ہے بیشک یہ گزشتہ روز کے مقابلہ میں ثبات وآرام کی حالت میں ہو گی اور اس دنیا کے نواقص اور کمی بیشی کو دور کر کے اسے مکمل کر کے ہر توانائی کو سرگرم عمل کرے گی۔

لیکن کیا یہ ثبات اور کمال نسبی ہو گا اور یہ صفت صرف آج کی دنیا کی حالت کے موازنہ میں ہو گی، یا ثبات وآرام نفسی پیدا کر کے کسی قسم کا تحوّل اور تبدیلی پیدا نہیں ہو گی۔؟

اور کیا دوسرے تغیر سے کائنات کی کلی حرکت۔ جو اپنے مقصد اور غرض تک پہنچنے کے بعد اسی مقصد اور غرض میں تبدیل ہو کر آرام پیدا کرتی ہے۔ آج کی جزئی حرکتوں کے مقصد اور غرض کے مانند نسبی پائداری اور آرام کی حامل ہو گی؟ اگرچہ دوسری جہات سے حرکت میں دوڑ دھوپ اور نشیب وفراز کی حالت میں ہے یا یہ کہ آئندہ دنیا کا اپنا حقیقی کمال وثبات ہو گا اور اس دنیا میں ہر مظہر کی حقیقی پیدائش کا رول ادا کرنے والا تغیر وتحول کا حساب بالکل بند ہو کر روزگار کا پرکار اپنے ابتدائی نقطہ پر پہنچ کر اپنی گردش کو خاتمہ بخش کر ایک ثابت اور مکمل دائرہ کو اپنی جگہ پر چھوڑ دے گا اور آج کے ادراک میں تغیر پیدا کر کے، اسے چار بعدی بنا کر دوسرے دن کے مظاہر گزشتہ اور آنے والے دن کے گرد نہیں ہوں گے؟

جو کچھ مذکورہ اجمالی بیان میں واضح ہوتا ہے، ایک ایسا سربستہ نتیجہ اور مطلب ہے جو مکمل طور پر پیچیدہ اور مشکل ہے، اس روان اور ناقص دنیا کے پیچھے ایک ثابت اور مکمل دنیا ہے، ایک باآرام منزل مقصود ہے جس کی طرف کاروان خلقت انتہائی تلاش وکوشش سے رواں دواں ہے اور اس راہ کے تمام راہی

ایک دن اپنی کوششوں کے نتیجہ کو فعلیّت کی صورت میں وہاں پر حاصل کریں گے۔

البتہ انسان اس نتیجہ کو قبول کرنے کی راہ میں، مذکورہ سوال اور دسیوں اور سیکڑوں دوسرے سوالات سے روبرو ہے جو مجہولات کے ایک سلسلہ کی تاریکی کو ظاہر کرتے ہیں اور حقیقت میں کچھ مباحث کو تشکیل دیتے ہیں، جنھیں پیچیدہ ترین اور عمیق ترین کلی اور فلسفی بحث شمار کی جاسکتی ہے کیونکہ حس کا سہارا نہ رکھنے والے کلی نظریئے ہمارے لئے قابل فہم نہیں ہیں۔ جہاں تک ہم اپنی آنکھیں کھول کر اس مادی دنیا کے مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں اور جو کچھ ہمیں اس کے گوشہ وکنار سے دکھائی دیتا ہے حرکت، نقل وانتقال اور زوال کی حالت میں ہے اور ہم خود بھی اس کاروان اور اس راہ کے راہی ہیں اور ہم میں سے جو بھی اس دنیا سے آنکھ بند کر کے چلا جاتا ہے، پھر اس کی ہمیں کوئی خبر نہیں ہوتی (اور جو خبر دار ہوا اس سے کوئی خبر لوٹ کے نہیں آتی (

اس کے باوجود منطقی مقدمات اور ناقابل انکار اور یقینی استدلالوں پر مبنی دقیق فلسفی بحثیں تالیف ہوئی ہیں، جو ان سوالات میں سے اکثر کا جواب دیتی ہیں اور یہ نظریہ (یہ رواں اور متحرک دنیا ایک پائیدار اور ثابت مقصد کی حامل ہے) معاد کے موضوع کے مطابق ہے جس کو اولیائے دین نے وحی سے حاصل کر کے خبر دی ہے۔

مقالہ کی ابتداء میں جو بحث ہم نے کی، اس سے واضح ہوا کہ ''غرض'' کا موضوع فعل سے ایک رابطہ ہے جو حرکت فعلی کو سکون وآرام میں تبدیل کرتا ہے اور فاعل کے ساتھ ایک رابطہ ہے جو اس کے وجود میں پائے جانے والے نقص کو کمال میں تبدیل کرتا ہے۔ خالق کائنات کے بارے میں کی گئی استدلالی بحثوں کے مطابق، اس کی مقدس ذات کمال محض کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے اور اس میں کسی قسم کے نقص ونیاز مندی کو نہیں پایا جاسکتا ہے۔

مذکورہ دو نظریوں کے پیش نظر خالق کائنات کے فعل کی نسبت مقصد واثبات کا فرض کیا جاسکتا ہے جیسا کہ تفصیلی طور پر بیان ہوا، لیکن اس کی ذات مقدس کے بارے میں منفی جواب دینا چاہئے، اور دوسرے الفاظ میں یہ جو کہا جاتا ہے کہ اصل خلقت کا مقصود اور غرض کیا ہے؟ اور کیوں خدائے متعال نے اپنے علاوہ کسی مخلوق کو پیدا کیا ہے؟ اگر اس کا مقصود یہ ہے کہ خدائے متعال کے فعل کا مقصد کیا ہے اور اس کی توجہ کس غایت اور انتہا کی طرف ہے (فعل کی غرض) اس کا جواب یہ ہے کہ اس ناپائیدار دنیا کا مقصد ایک مکمل ترین دنیا ہے، اور اگر مراد یہ ہے کہ خدائے متعال خلقت کے ذریعہ اپنی کسی کمی کو پورا کرتا ہے اور کونسا کمال یا فائدہ اپنے لئے حاصل کرتا ہے تو یہ سوال غلط ہے اور اس کا جواب منفی ہے۔

مقصد خلقت کے سوال کے بارے میں جو جواب دینی زبان میں دیا جاتا ہے: ''کائنات کو پیدا کرنے کا خدا کا مقصد دوسروں کو نفع پہنچانا ہے نہ خود کو'' اس کا مطلب وہی معنی ہے جو بیان ہوا۔

آخر میں اس نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ، جس طرح بحث وتحقیق میں ''مقصد'' کا معنی بیان کیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مقصد اس جگہ پر محقق ہوتا ہے جہاں فعل اور فاعل یا صرف فعل میں کوئی نقص ہو جو مقصد سے دور ہو جائے۔ اس بناپر، اگر کسی فعل، یعنی کسی خالق کے بارے میں فرض کیا جائے جس میں کسی قسم کا قابل رفع نقص نہ پایا جاتا ہو (فلسفی اصطلاح میں مجرّد عقلی کے مانند) تو مذکورہ معنی میں کوئی مقصد نہیں ہوگا۔

جی ہاں! فلاسفہ نے دقیق ترین تجزیہ وتحقیق سے ثابت کیا ہے کہ فعل کا مقصد حقیقت میں فعل کا کمال اور فاعل کا مقصد فاعل کا کمال ہے۔ منتہیٰ یہ کہ فعل کبھی تدریجی ہے اور اس کا کمال آخر کار اس سے جاملتا ہے اور کبھی اچانک مادّہ اور حرکت سے مجرّد ہے اور اس صورت میں فعل کا وجود بھی اور کمال ومقصد فعل بھی خود فعل ہے۔

اس طرح کبھی فاعل ناقص ہے اور فعل کے بعد اپنے کمال کو پاتا ہے اور کبھی فاعل مکمل ہے اور اس صورت میں وہ فاعل بھی ہے اور غایت وغرض بھی اور

اس لحاظ سے خالق کائنات کا کائنات کو خلق کرنے کا مقصد اپنی ذات کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس کے فعل کا مقصد یہ ناقص دنیا ہونا،(درحقیقت) ایک مکمل تر دنیا ہے اور کامل تر دنیا کا مقصد، خود وہی کامل تر دنیا ہوگا۔

اور اسی طرح ہر فرض کئے جانے والے کامل تر خالق کے بارے میں اس کی خلقت کا مقصد خود وہی ہوگا۔ والسلام

خدا کو کیا ضرورت ہے کہ انسان کی آزمائش کرے؟

سوال: اگر ایک شخص دو لوٹے بنائے ایک پر ایک دستہ اور دوسرے لوٹے پر دو دستے نصب کرے، خود وہ شخص ایک دستہ والے لوٹے سے اعتراض نہیں کر سکتا ہے کہ تم کیوں ایک دستہ رکھتے ہو، چونکہ وہ لوٹوں کا صانع ہے اگر لوٹوں کو اس کی آنکھوں سے اوجھل بھی کیا جائے پھر بھی وہ ان کے حالات سے واقف ہے اور ان کی بناوٹ، رنگ اور صورت کو بخوبی جانتا ہے۔

یا مثال کے طور پر اگر ایک آرٹسٹ نے ایک منظر کی نقاشی کر کے اول سے آخر تک اپنی پسند سے اس میں رنگ بھر دئے ہوں، تو وہ منظر کی کیفیت سے واقف ہے اور وہ خود نہیں کہہ سکتا ہے کہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ منظر اچھا ہے یا برا، کیونکہ جو اپنے ہاتھ سے کسی چیز کو بنائے اس کے لئے لازم نہیں ہے اس کے بارے میں تجسس اور تحقیق کرے۔

لیکن اصلی مطلب یہ کہ خدائے متعال نے تمام زمینی و آسمانی مادیات و معنویات کو خلق کیا ہے اور اول سے آخر تک کائنات کے بارے میں بخوبی جانتا ہے، کیونکہ سب سے پہلے وہ خود اس کا صانع ہے اور دوسرے یہ کہ اگر نہ جانتا ہو، تو عاجز ہے اور اس صورت میں خدا عاجز نہیں ہو سکتا کیونکہ خدائے متعال عجز سے مبرّا ہے۔ لہذا اس کی کیا ضرورت ہے کہ خدائے متعال بشر کو خود خلق کر کے اس کی خود حق ارادیت اور تقدیر اس کے ہاتھ میں سونپنے کے بعد خود اس کا امتحان لے لے؟!

جواب: بشر کی آزمائش اور خدائے متعال کے امتحان کے بارے میں ذکر کر کے آخر میں خط کے ذیل میں آپ نے اس عبارت پر خلاصہ کیا ہے: ''اس کی کیا ضرورت ہے کہ خدائے متعال بشر کو خود خلق کر کے اس کے اختیارات اور تقدیر اس کے ہاتھ میں سونپنے کے بعد خود اس کا امتحان لے لے؟''

یہ جاننا چاہیئے کی خدائے متعال اپنے قرآنی تعلیمات میں خلقت کے راز کے بارے میں دو طریقوں سے بحث کرتا ہے:

۱۔ اجتماعی منطق کے طریقہ سے لوگوں کے متوسط طبقہ سے ان ہی کی زبان میں ان سے گفتگو کر کے تعلیم دیتا ہے۔ اس منطق کے مطابق خالق کائنات مطلق حکم فرما مطلقہ سلطنت رکھنے والا اور بندوں کا مالک ہے کہ سب اس کے بندے ہیں۔ لوگوں کی دنیوی زندگی جو ان کی اخروی اور ابدی زندگی کا مقدمہ ہے، اس کی مشیت، ارادہ، احکام اور تکالیف کے مطابق ہونی چاہئے اور آخرت میں وہ اپنے اعمال کی جزا پائیں گے اور اس لحاظ سے ان کی دنیوی زندگی ایک آزمائشی اور امتحانی زندگی ہوگی ان کا امتحان لینے والا خدا ہے اور قرآن مجید کی آیات اس نظریہ کے مطابق بحث کرتی ہیں چنانچہ فرماتا ہے:

)کل نفس ذائقۃ الموت و نبلوکم بالشر والخیر فتنۃ...)(انبیاء ۳۵(

''ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور ہم تو اچھائی اور برائی کے ذریعہ تم سب کو آزمائیں گے''...

۲۔ خالص منطق عقلی کے طریقہ اور حقیقت بینی اور حقیقی عالم شناسی سے یہ نظریہ خدا اور خلقت عالم اور اس کے نیک و بد حوادث کے مانند ہے اور ان کی

مثال اس آٹسٹ کی جیسی ہے جو ایک خوبصورت اور بدصورت اور نیک وبد منظر کو ایک بورڈ پر تصویر کشی کرتا ہے اور پھر اس مصوّر اور اس کے چہرے کی طرف کسی قسم کی توجہ نہیں کی جاتی اور آمائش کا معنی پیش نہیں آتا ہے۔ صرف ایک بنیادی نکتہ کے بارے میں غفلت نہیں کی جانی چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ فرض کیا جانا چاہئے بورڈ پر جو انسانی تصویریں موجود ہیں وہ اپنے اختیار سے کام کرتی ہیں، یعنی اس طرح تصویر کشی کی گئی ہے، اور ان کا کام خوبصورت وبد صورت ہے اور ان کے آئندہ کے خوب وبد نقشے ان کے کام کے ساتھ بلاواسطہ رابطہ رکھتے ہیں۔ (دقت کی جائے(

چھ دنوں میں آسمانوں اور زمین کی خلقت

سوال: خدا کا ارادہ فوری ہے، جوں ہی ارادہ کرتا ہے معدوم، موجود بن جاتا ہے اس مطلب کے باوجود کیا آسمانوں کی خلقت چھ دن میں انجام پائی ہے؟

جواب: خط میں جو اعتراض ذکر ہوا ہے وہ ایک فلسفی اعتراض ہے کہ فلسفہ کی کتابوں میں اس کی وضاحت کی گئی ہے اور مناسب جواب دیا گیا ہے اور مذکورہ اعتراض صرف چھ دنوں میں آسمان کی خلقت سے مربوط نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پیش نظر کہ عالم مشہود کے تمام مظہر نظام حرکت کے تحت ہیں اور ہر چیز کی پیدائش خاص حرکتوں سے ہوتی ہے اور اس کی تخلیق تدریجی ہوتی ہے اور شے کے وجود کا تدریجی ہونا موثر کے دفعتہ ہونے کے منافی ہے۔ اس عالم کے تمام اجزاء میں یہ اشکال موجود ہے اور یہ آسمانوں کے چھ دن میں پیدا ہونے سے مخصوص نہیں ہے، کیونکہ خدائے متعال کا ارادہ ذات کی صفت نہیں ہے بلکہ صفت فعل ہے جو ذات سے خارج ہے اور فعل کے مقام سے الگ ہوتا ہے اور جو ہم یہ کہتے ہیں: ''خدائے تعالی نے فلاں چیز کا ارادہ کیا ''کا معنی یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اس چیز کے وجود کے علل واسباب مہیا کئے ہیں (عالم، عالم اسباب اور حکومت قانون علیّت کے تحت ہے) اس بناء پر امور دفعی الوجود یں، مطابقت ارادہ اور مراد ارادۂ خدا، دفعتہ ہے اور امور تدریجی میں تدریجی ہے اور کسی قسم کا مانع بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک ایسی صفت ہے جو فعل سے قائم ہے نہ ذات سے تاکہ ذات میں تغیر لازم آئے۔

لیکن اصلی اعتراض، وہی حادث کا قدیم سے رابطہ، یعنی متغیّر کا ثابت سے رابطہ اور دوسرے الفاظ میں، معلول زمانی کا خارج از زمان کی علّت سے رابطہ ہے ۔ یہ فلسفہ اور کلام کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے اور مزید تفصیلات اور وضاحت کے لئے ان کتابوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

جس چیز کی طرف اس خط میں مختصر طور پر اشارہ کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ تدریج وتغیّر کی صفت اور زمان کا معنی جیسے بڑاپن اور چھوٹاپن، نسبی اور قیاسی معنی میں سے ہے کہ اس دنیا کی موجودات توازن کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور اشیاء کی خدائے متعال سے نسبت ایک ثابت اور پائیدار نسبت ہے اور وہ ان صفتوں سے منزّہ ہے۔ قرآن مجید نے اس مطلب کو مندرجہ ذیل دو آیتوں میں بیان فرمایا ہے:

)انما امرہ اذا اراد شیئاان یقول لہ کن...)(یس، ۸۲(

''اس کا امر صرف یہ ہے کہ کسی شے کے بارے میں یہ کہنے کا ارادہ کرلے کہ ہو جاؤ''...

)وما أمر ناالّا واحدۃ کلمح بالبصر)(قمر، ۵۰(

''اور ہمارا حکم پلک جھپکنے کی طرح کی ایک بات ہے۔''

پہلی آیہ شریفہ کے مطابق، جو کام خدائے متعال کسی چیز کے ارادہ کے وقت انجام دیتا ہے اس کا پیدا ہونا، یعنی اس کا وجود خارجی ہے۔ اور دوسری آیت کے مطابق اشیاء کا وجود خارجی خدا کی نسبت ثابت وپائدار اور زمان سے خارج ہے، یعنی اشیاء ایک دوسرے کی نسبت زمانی، متغیّر اور تدریجی ہیں اور خدا کی نسبت ثابت، غیر متغیّر اور غیر تدریجی ہیں۔

قیامت پر اعتقاد رکھنے کے اثرات

سوال: قیامت پر ایمان، انسان کے اخلاق واعمال پر کیا اثر رکھتا ہے؟ اور اس سے انسانی معاشرہ کے کس حصہ کی اصلاح ہوتی ہے؟ کیونکہ اس میں شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انسانی معاشرہ افراد کی سرگرمی سے زندہ ہے اور افراد کی سرگرمی بھی احتیاج کی حس اور زندگی کی ضرورتوں سے آگاہ ہونے کے اثر میں وجود میں آتی ہے۔ انسان اپنی بقاء اور اس بقاء کی ضروریات کے بارے میں شدید دلچسپی رکھتا ہے۔ اس لئے اس آرزو کو حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن وسائل کو بروئے کار لاکر عزم وارادہ کے ساتھ اپنی انتھک سرگرمیوں کو جاری رکھتا ہے۔ ان اعمال میں سے جو بھی عمل مقصد تک پہنچ جائے، انسان کی سرگرمی کو شدت بخش کر اس کت عزم وارادہ کو تقویت بخشتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انسانی معاشرہ جوں ہی اپنے عادی راستہ پر گامزن ہوتا ہے تو ایک قسم کی ترقی حاصل کرکے ہر دن اور ہر ساعت اپنی پیش رفت کی حرکت میں تیز تر ہوتا ہے اور اس میں ایک عمیق اور تازہ جوش وجذبہ ظاہر ہوتا ہے اور واضح ہے کہ موت کی یاد، موت کے بعد آخرت کی زندگی کی فکر کو دماغ میں پرورش دینا، اگر انسان کے عزم وارادہ کو مفلوج نہ کرتے ہوئے معاشرہ کے روزافزوں سرگرمیوں کے پہیئے کو گھومنے سے نہ روکتا، تو انسان کی سیر وسلوک کی اس زندگی میں کسی قسم کا اثر نہ ہوتا اور اس کے قالب میں ایک نئی روح نہیں پھونکی جاسکتی۔

جواب: اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آسمانی ادیان نے اپنی دعوت کے پروگرام کو کسی حد تک تکلیف کی مسؤلیت اور اعمال کی پاداش (یعنی روز جزا) پر رکھا ہے اور خاص طور پر (ان میں) دین مقدس اسلام نے اپنی دعوت کی بنیاد کو تین اصولوں پر استوار کیا ہے ان میں سے تیسرا اصول معاد پر اعتقاد ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کو معاد پر شک ہو تو، اس کی مثال اس شخص کی جیسی ہے جو توحید یا نبوت کا منکر ہو، وہ دین کے حدود میں داخل نہیں ہوا ہے اور مسلمانوں کے زمرہ سے خارج ہے۔ یہاں اسلامی معاد کے اعتقاد کو دی جانے والی اہمیت۔ توحید ونبوت کے اعتقاد کے مانند۔ واضح ہوتی ہے۔

اس نکتہ کے پیش نظر کہ اسلام نے اپنی تعلیم وتربیت کی آرزو کو انسانی فطرت (فطری انسان کو پیدا کرنے کے لئے) کو احیاء کرنا قرار دیا ہے، اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام معاد کے اعتقاد کو فطری انسان کے حیاتی ارکان میں سے ایک رکن قرار دیتا ہے کہ اس کے بغیر حقیقی انسان کی شکل ایک بے روح جسم کے مانند ہے جس نے ہر انسانی سعادت وفضیلت کی بنیاد کو کھو دیا ہے۔

اس میں بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اسلام کے معارف اور قوانین خشک وبے روح مواد نہیں ہیں، جو لوگوں کی سرگرمی کی غرض سے یا خشک اور خالی تعبد اور تقلید کے مقصد سے مرتب ہوئے ہوں بلکہ یہ اعتقادی، روحی اور عملی مواد کا ایک مجموعہ ہے جو اپنے اجزاء میں پائے جانے والے تشکّل کے کمال اور رابطہ سے انسان کی زندگی کے پروگرام کے عنوان سے اور انسان کی خلقت کی ضروریات کے پیش نظر مرتب ہوا ہے، چنانچہ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات اس مطلب کی بہترین گواہ ہیں:

)یا أیّھاالذین اٰمنوا استجیبوا اللہ وللرّسول اذا دعاکم لما یحییکم ...)(انفال،۲۴(

"اے ایمان والو! اللہ ورسول کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس امر کی طرف دعوت دیں جس میں تمہاری زندگی ہے"...

)فأقم وجھک للدّین حنیفاً فطرت اللہ التی فطر النّاس علیھا...)(روم،۳۰(

"آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارکش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے"...

اس بناء پر، دین اسلام ترقی یافتہ معاشروں کے ان ملکی قوانین سے کوئی فرق نہیں رکھتا، جو معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنیاوراس کے حیاتی منافع کی حفاظت کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ منتہی خدائی دین اور انسان کے وضع کئے گئے قوانین کے درمیان پایاجانے والابنیادی فرق یہ ہے کہ ملکی قوانین ،انسان کی زندگی کے پروگرام کے قانونی ضوابط ہیں، صرف اس کی چندروزہ مادی زندگی کو مد نظر رکھتے ہیں اور مشخص قانونی دفعات کو صرف معاشرہ کی اکثریت کی جذباتی ضرورتوں کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن دین آسمانی،انسانی زندگی کوایک ایسی ابدیاور لا متناہی زندگی تشخیص دیتاہے جو موت سے ہر گز ختم نہیں ہوتی اور ہمیشہ کے لئے ایسے باقی اور پائدار رہتی ہے کہ اس کی دوسری دنیا کی بدبختی اور خوشبختی اس دنیا کے اعمال کی برائیوں اور بھلائیوں کے تناسب سے ہوتی ہے۔اس لئے دین اسلام انسان کے لئے عاقلانہ زندگی کاپروگرام مرتب کرتاہے نہ جذباتی زندگی کا۔

ملکی قوانین کی نظر میں، معاشرہ میں لوگوں کی اکثریت کی رائے کا نفاذ ضروری ہوتاہے اور یہ قوانین کے دفعات میں سے ایک دفعہ ہوتی ہے۔ لیکن دین اسلام کی نظر میں معاشرہ میں ایسے قوانین قابل اجراہیں جو حق اور عقل کی کسوٹی کے مطابق ہوں، خواہ اکثریت کی رائے کے مطابق ہوں یانہ۔

دین اسلام بیان کرتاہے کہ فطری انسان (خرافات اور ہوس رانیوں سے پاک) اپنے فطری شعور سے معاد کو ثابت کرتاہے اور نتیجہ کے طور پر اپنے آپ کو ایک ابدی زندگی کامالک سمجھتاہے کہ اسے صرف انسانیت کی خصوصی نعمت یعنی عقل سے زندگی بسر کرناچاہئے،اس کوایک مادّی شخص کی طرح اپنی بنیاد اور معاد سے بے خبر نہیں رہناچاہئے، کہ یہ منطق حیوانی منطق میں مشترک ہےاور اس حالت میں انسان مادی لذتوں پر تسلط جمانے کے علاوہ کوئی آرزو نہیں رکھتا۔ قیامت پر ایمان اور معاد پر اعتقاد ایک حقیقت پسند انسان کی فکری،اخلاقی،روحی اور اس کے اجتماعی اور انفرادی اعمال کے تمام ابعاد پر واضح اثر ڈالتاہے۔

لیکن اس کی فکر پر اثر،اس طریقہ سے ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور تمام چیزوں کو۔ جیسے وہ ہیں۔ حقیقت پسندانہ نگاہ سے دیکھے۔ وہ اپنے آپ کو چندروز کے لئے محدود ایک انسانی موجود مشاہدہ کرتاہے جو اس ناپائدار دنیا کا ایک جزو ہے۔ وہ اور عالم ہستی کے دیگر اجزا مجموعاًایک ایسے قافلہ کو تشکیل دیتے ہیں جو شب وروز ایک پائدار اور ابدی دنیا کی حرکت میں ہے اور خلقت ''علت فاعلی'' کے ''رفع''اور خلقت کی غرض وغایت (قیامت) کے ''جذب'' کے درمیان ہمیشہ مسافرت میں ہوتاہے، لیکن اس کے روحی اخلاق میں اس صورت میں اثر ہوتاہے کہ وہ اپنی واقع بینی اور اپنے اندورونی جذباتی طرز تفکر کو بدل کر انھیں مقصد کے مناسب اسلوب سے محدود کرے۔

جو شخص اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے خود کو اس ناپائدار عالم ہستی کے تمام اجزاء سے وابستہ جانتے ہوئے اپنے آپ کو طوفان کی خطرناک لہروں کے پنجوں میں ایک تنکہ کے مانند گرتے اٹھتے عام مقصد کی طرف بڑھتاہواپائے، تو وہ اس خود پسندی، غرور اور جاہلانہ بغاوتوں کو اپنے دماغ میں پنپنے نہیں دے گا، وہ خود کو شہوت پرستی، نفسانی خواہشات اور ہوس رانی کا غلام نہیں بنائے گا، اور وہ ایک چندروزہ انسانی زندگی کے لئے ضروری چیزوں کے علاوہ بے مقصد تلاش اور کوششوں کا اسیر وگرفتار بن کر خود کو ایک خودکار اور بے ارادہ مشین میں تبدیل نہیں کرے گا۔اس کے نتیجہ میں انسانی زندگی کے فردی اور اجتماعی بلواؤں میں کافی حد تک کمی واقع ہوتی ہے، پھر وہ اپنی تلاش وکوششوں کو ایسے کاموں میں ضائع نہیں کرے گا جن کے لئے قربانی دے کر جان ومال سے ہاتھ دھوناپڑتاہے، کیونکہ اگر نیک کام انجام دینے کی راہ میں اس کی جان بھی قربان ہوجائے تو اس نے اس غمناک دنیوی زندگی کو کھودیاہے ، لیکن وہ اس طرح اپنی ابدی زندگی اور جانثاری کے نیک نتائج کو پاتاہے اور ان سے خوشحال ہوگا،اب اس سے ایک مادی اور معاد سے بے خبر شخص کے مانند اپنی دنیوی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے فریب دینے والے اور گمراہ کرنے والے خرافات کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔اب وہ نہیں چاہتا

ہے کہ اسے اس بات کی تلقین کی جائے کہ معاشرے کے مقدسات۔ آزادی، قانون اور وطن کے مانند۔ انسان کے لئے نیک نامی اور پائندگی لاتے ہیں جن کے ذریعہ وہ ایک ابدی اور فخر ومباہات کی زندگی پاسکتا ہے، جبکہ اگر حقیقتاً انسان مرنے کے بعد نابود ہوتا ہے، تو مرنے کے بعد زندگی اور فخر، خرافات کے علاوہ کوئی مفہوم نہیں رکھتے!!

یہاں پر، سوال کے آخر پر بیان کی گئی بات کا بے بنیاد ہونا واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ موت اور موت کے بعد والی دنیا کا تصور، انسان سے نشاط کار اور زندگی کی سر گرمی کو سلب نہیں کرتا، کیونکہ نشاط کار اور انسان کی سر گرمی احتیاج کی معلول حسّی ہے اور معاد کے تصور سے احتیاج کی حس نابود نہیں ہوتی ہے۔ اس مطلب کا گواہ یہ ہے کہ صدر اسلام کے مسلمان دینی تعلیمات کی بیشتر پیروی کرتے تھے اور ان کے دلوں میں معاد کا تصور دیگر توانائیوں سے زیادہ جلو گر تھا، وہ لاجواب اور حیرت انگیز اجتماعی سر گرمی میں مشغول تھے۔

معاد پر ایمان کے روحی فوائد میں سے یہ ہے کہ انسان کی روح ہمیشہ اس ایمان سے زندہ ہے وہ جانتا ہے کہ اگر وہ کبھی کسی مظلومیت یا محرومیت سے دوچار ہوا تو ایک دن آنے والا ہے جب انتقام لیا جائے گا اور اس کا حق اس سے واپس ملے گا اور وہ جو بھی نیک کام انجام دے گا ایک دن اس کی بہترین صورت میں تجلیل و تعظیم کی جائے گی۔

لیکن انسان کے فردی اور اجتماعی اعمال میں اس کا اثر اس طرح ہے کہ معاد کا معتقد انسان جانتا ہے کہ اس کے اعمال ہمیشہ تحت نظر اور کنٹرول میں ہیں اور اس کے ظاہر و باطن (مخفی و آشکار) اعمال خدائے دانا و بینا کے سامنے واضح ہیں ایک دن آنے والا ہے جب پوری دقت سے اس کا حساب و کتاب کیا جائے گا۔ اور یہ عقیدہ انسان میں ایک ایسا کام انجام دیتا ہے جو ہزاروں مخفی پولیس کے اہل کار اور مامورین سے انجام نہیں پاسکتا ہے، کیونکہ وہ سب باہر سے کام کرتے ہیں اور یہ ایک داخلی چوکیدار ہے جس سے کوئی راز چھپایا نہیں جاسکتا ہے۔

چوتھا حصہ:

کچھ سوالات اور جوابات

کچھ سوالات اور جوابات(ا(

مرد اور عورت کے مساوی ہونے کی کیفیت اور عورتوں کی سیاست میں مداخلت:

سوال: کیااسلام کے قانون میں مرد اور عورت مساوی ہیں؟اور کیا عورت سیاست اور ملکی معاملات میں مداخلت کر سکتی ہے اور مرد کے ساتھ مساوی ہو سکتی ہے؟

جواب: اسلام کے آغاز پر،انسانی معاشرہ عورت کے بارے میں درج ذیل دو عقیدوں میں سے ایک عقیدہ رکھتا تھا: ایک گروہ عورتوں کے ساتھ پالتو جانوروں جیساسلوک کرتا تھا،اس کی نظر میں عورت معاشرہ کا رکن نہیں تھی لیکن اس سے تسلّط اور معاشرہ کی نفع میں خدمت، جیسے استفادے کئے جاسکتے تھے۔ دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد مہذّب تر تھے اور عورت کے ساتھ ایک ناقص رکن جیسا سلوک کرتے تھے۔ان کے سامنے عورت ایک بچہ یااسیر کے مانند معاشرہ کی طفیلی تھی اور اپنی حالت کے مطابق کچھ حقوق رکھتی تھی اور مردوں کے ذریعہ ادارہ ہوتی تھی۔ یہ دین اسلام تھا جس نے عالم بشریت میں پہلی بار معاشرہ میں عورت کی مکمل رکنیت کا اعلان کیا اور اس کے کام کو محترم

ا۔۱۳۸۳ھ (۱۹۶۲ء) نیویارک (امریکہ) میں ایرانی مقیم دانشوروں میں سے ہر ایک نے استاد علامہ طباطبائی سے اسلام کے مختلف موضوعات پر گوناگوں سوالات کئے تھے کہ علامہ نے تمام سوالات کے جوابات لکھ کر ایک ساتھ انھیں روانہ کئے تھے۔

ہم اس کتاب میں ان سوالات اور ان کے جوابات کو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ ان موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے محققین ان سے استفادہ کریں(ادارہ (

جانا: ''میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کو ضائع نہیں کروں گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک خلقت رکھتے ہو۔''ا۔

اجتماعی موضوعات میں سے صرف تین موضوعات میں عورت کو،اسلام نے مداخلت کی اجازت نہیں دی ہے: حکومت، فیصلہ دینا اور جنگ، قتل کے معنی، میں نہ جنگ سے مربوط دیگر حصوں کے معنی میں۔اس کا فلسفہ۔ جیسا دینی محور سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ عورت ذات ایک جذباتی اور احساساتی مخلوق ہے، مرد کے برخلاف کہ ایک استدلالی مخلوق ہے اور یہ تین موضوع استدلال سے مربوط ہیں نہ جذبات سے اور بدیہی ہے کہ ایک جذباتی مخلوق کو سو فیصدی استدلالی امور میں کسی قسم کا دخل نہیں دینا چاہئے اور فطری طور پر وہ اس میں نشو ونما نہیں پا سکتی ہے۔

اس نظریہ کے لئے بہترین گواہ وہ مشترک کوشش ہے جس سے مغربی دنیا نے مرد اور عورت کی مشترک تعلیم وتربیت میں استفادہ کیا ہے، لیکن اس کے باوجود آج تک معاشرہ کے ان تین شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ میں بھی عورتوں کی کوئی قابل توجہ تعداد کو پیش نہیں کر سکے ہیں عدلیہ، سیاست یا جنگی

سرداروں کے نابغوں کی فہرست میں(مثلاً،نرسوں، رقاص، فلمی ستاروں، نقاشی اور موسیقی کے برخلاف)مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کا تناسب بہت ناچیز ہے، مساوی کی بات ہی نہیں۔

ا۔(...انی لااضیع عمل عامل منکم من ذکراوانثی بعضکم من بعض...)(آل عمران،۱۹۵(

مرداور عورت کی وراثت کی کیفیت

سوال:عورت کو مرد کی نسبت کیوں وراثت کم ملتی ہے ؟

جواب:اسلام میں عورت، میراث میں سے مجموعی طور پرایک حصہ اور مرد دوحصے لیتاہے(جیسا کہ روایت میں ہے)اس کا سبب یہ ہے کہ عورت کی زندگی کا خرچہ مرد(شوہر) کے ذمہ ہے اوراس حکم کا سرچشمہ بھی عورت کا جذباتی ہواور مرد کا استدلالی ہوناہے۔

وضاحت:ہر زمانہ میں زمین پر موجود سرمایہ ایک نسل سے متعلق ہوتاہے جواس زمانہ میں زندگی کرتی ہے اور بعد والی نسل پہلی نسل کی جانشین بن کراس سرمایہ کو میراث کے طورپر حاصل کرتی ہے اور چونکہ مجموعی طورپر عورتوں اور مردوں کی آبادی ہمیشہ متفاوت رہی ہے اور اسلام کی نظر میں عمومی ثروت کا ۳؍۴ حصہ مرد کا اور ۳؍۱ حصہ عورت کا ہوتاہے اور دوسری طرف سے مرد کے عورت کے اخراجات کا ذمہ دار ہونے کی وجہ سے عورت اپنے خرچ میں مرد کے حصہ میں شریک ہوتی ہے جبکہ ۳؍۱ حصہ اپنا حصہ رکھتی ہے اور نتیجہ کے طورپر سرمایہ کا ۳؍۲ حصہ خرچ کے طورپر عورت کے اختیار میں اور ۳؍۱ حصہ مرد کے اختیار میں قرار پاتاہے، نتیجہ کے طورپر خرچ کے لحاظ سے سرمایہ کا ۳؍۲ حصہ جذبات کا اور ۳؍۱ حصہ استدلال کا ہوگا اور یہ بذات خود ایک بہترین اور عادلانہ تقسیم ہے، اس کے علاوہ یہ ترتیب خاندان کی تشکیل میں گہرے اور نفع بخش اثرات رکھتی ہے، چنانچہ بندء ۱۱ کے جواب میں اشارہ کیاجائے گا ا۔

ا۔ص ۱۴۳۔ص ۱۴۵کی طرف رجوع کیاجائے۔

مرداور طلاق کا حق

سوال:طلاق کا حق صرف مرد کو کیوں ہے ؟

جواب:دینی بیانات کے لہجہ سے معلوم ہوتاہے کہ یہ مسئلہ بھی مرد کے استدلالی اور عورت کے جذباتی ہونے سے مربوط ہے۔اس کے علاوہ اسلام کی شرع میں ایسے راستے بھی موجود ہیں، جن کے ذریعہ عورت ازدواج کے وقت مرد کے اختیارات کو کسی حد تک محدود کرسکتی ہے یااپنے لئے طلاق کے کچھ اختیارات حاصل کرسکتی ہے

اقتصادی امور میں عورت کی آزادی

سوال: کیا عورت اقتصادی اور مالی امور میں آزاد ہو سکتی ہے؟

جواب: اسلام میں عورت اپنے بارے میں اقتصادی اور مالی امور میں مکمل اور ہر قسم کی آزادی رکھتی ہے۔

مرد اور تعدّد ازدواج

سوال: مرد کیوں کئی بیویاں رکھ سکتا ہے؟

جواب: البتہ معلوم ہے کہ اسلام نے تعدّد ازدواج کو واجب قرار نہیں دیا ہے بلکہ صرف اجازت دی ہے کہ مرد ایک سے زیادہ چار عورتوں تک ازدواج کر سکتا ہے وہ بھی صرف اس شرط پر کہ ان کے درمیان مساوات اور عدالت سے پیش آ سکے۔ اور اس کا حکم صرف ماحول کے مطابق ہے، یعنی یہ اس طرح ہونا چاہئے کہ عورتوں کی کمی اور مردوں کی فراوانی کی وجہ سے معاشرہ کا نظم و نسق اس عمل (تعدّد ازدواج) سے درہم برہم ہو کر ہرج و مرج سے دوچار نہ ہو جائے۔ لیکن مردوں کی طرف سے واضح ہے، کیونکہ عورت اور اولاد کی رہائش اور زندگی کا خرچہ مرد کے ذمہ ہے اور عدالت کی بھی شرط ہے، لہذا اس کے نتیجہ میں ایسا اقدام کرنا معدود مردوں کے لئے ممکن ہے نہ ہر ممکن کے لئے۔ دوسری طرف سے فطرت اور خارجی حوادث ہمیشہ قابل ازدواج عورتوں کی تعداد مردوں کی نسبت زیادہ مہیا کرتے ہیں۔

اگر ہم ایک معیّن سال کو ابتداء قرار دے کر، زن و مرد کی مساوی پیدائش کا موازنہ کریں تو سولھویں سال قابل ازدواج عورتوں کی تعداد سے سات گناہ زیادہ ہو گی اور بیسویں سال عورتوں کی تعداد مردوں کی نسبت گیارہ اور پانچ (۱۱-۵) ہو گی اور پچیسویں سال، جو تقریباً عام طور پر ازدواج کا سال ہوتا ہے یہ نسبت "۱۶-۱۰" ہو گی اور اگر اس صورت میں تعدد ازدواج والے مردوں کو ۵،۱ فرض کریں تو آٹھ فیصد مرد ایک بیوی والے ہوں گے اور بیس فیصد مرد چار بیویوں والے ہوں گے اور تیسویں سال بیس فیصد مرد تین بیویوں والے ہوں گے۔

اس کے علاوہ، عورت کی عمر مرد سے زیادہ ہوتی ہے اور معاشرہ میں ہمیشہ بیوہ عورتوں کی تعداد بیوہ سے مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مردوں میں جانی نقصان قابل توجہ حد تک عورتوں سے زیادہ ہوتا ہے اور خاص کر اہم اور عام جنگیں اس مطلب کے بہترین گواہ ہیں۔ ہم نے، حالیہ چند برسوں کے دوران روزناموں اور مجلات میں مکرر پڑھا ہے کہ جرمنی کی عورتوں نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ اسلام کے تعدّد ازدواج کے قانون کو جرمنی میں رائج کریں اور اس طرح بے شوہر عورتوں کی ضرورت کو پورا کریں، لیکن حکومت نے کلیسائی مخالفت کی وجہ سے اس درخواست کو منظور نہیں کیا۔

دوسری طرف سے تعدّد ازدواج سے عورتوں کی مخالفت فطری جبلّت کے احساس پر مستند نہیں ہے، کیونکہ دوسری، تیسری اور چوتھی بیوی رکھنے والے مرد زبردستی یہ کام انجام نہیں دیتے اور جو عورتیں کسی مرد کی دوسری، تیسری یا چوتھی بیوی بن جاتی ہیں، وہ آسمان سے نہیں اتری ہیں اور نہ زمین سے اگی ہیں بلکہ ان ہی عام عورتوں میں سے ہیں اور یہی رسم بہت سے اقوام اور ملتوں میں سیکڑوں اور ہزاروں سال سے رائج تھی۔ نہ کوئی جبلّتی برائی رونما ہوئی اور نہ عورت ذات کی میں کوئی کمی محسوس کی گئی ہے

دین اسلام کا بے عیب ہونا

سوال: کیا آپ اسے قبول کرتے ہیں کہ دین اسلام زمانہ کے گزرنے کو درک نہیں کر سکا ہے تاکہ دین زمان و مکان کے مطابق ہوتا؟

جواب: یہ "اسلام زمانہ کے گزرنے کو درک نہیں کر سکا ہے تاکہ زمان و مکان کے مطابق ایک دین ہوتا" ایک ایسی بات ہے جو فلسفی تفکر کے بجائے

شعری تفکّر کے مشابہ ہے۔ زمان ومکان نے تغیر نہیں کیا ہے تاکہ انسان کے اجتماعی قوانین میں تبدیلی کا موجب بنیں، دن اور رات وہی دن اور رات ہیں اور زمین اور ہوا وغیرہ ہزاروں سال قبل کے مانند ہیں، صرف انسان کی طرز زندگی اپنی روزافزوں ترقی کے پیش نظر تبدیل ہوئی ہے اور دن بدن انسان کے توقعات اور مطالبات بڑھتے یا تبدیل ہوتے رہتے ہیں انسان کی فعّال توانائی اپنی حیرت انگیز افزائش کے نتیجہ میں اسے یہ جرئت بخشتی ہے کہ عیش وعشرت کے جن انواع واقسام کے بارے میں کل کے پادشاہ تصور نہیں کرتے تھے آج کے فقیر ان کی فکر میں پڑ کر ان کا مطالبہ کریں۔

معاشرہ میں یہ فکری تبدیلی بالکل ایک فرد میں فکری تبدیلی کے مانند ہے جو اسے زندگی کے مختلف حالات کی وجہ سے پیش آتی ہے۔ ایک مفلس خالی ہاتھ والا شخص صرف اپنے شکم کی فکر میں ہوتا ہے اور ہر چیز کو فراموش کر ڈالتا ہے، جوں ہی اس کی روزمرہ کی روٹی مہیا ہوتی ہے، لباس کی فکر میں پڑتا ہے، اس کے بعد اولاد، اور سرمایہ کو وسعت دینے، فخر ومباہات، تکلفات اور گوناگوں عیاشیوں کو بڑھاوا دینے کی فکر میں پڑتا ہے اور اسی طرح...

آج کے اجتماعی قوانین معاشرہ کے اکثر لوگوں کے مطالبات کو اپنے لئے تحفظ قرار دیتے ہیں، اگرچہ معاشرہ کی حقیقی مصلحت کے مطابق بھی نہ ہوں، لیکن اسلامی طرز تفکر اس کے علاوہ ہے، اسلام اپنی تشریعیات میں طبیعی انسان کا (قرآن مجید کی اصطلاح میں انسانی فطرت کو) تحفّظ قرار دیتا ہے، یعنی انسان کی وجودی عمارت کو اسلحوں سے مسلح صورت میں مد نظر رکھتا ہے اور جن ضروریات کی یہ مسلح عمارت نشان دہی کرتی ہے ان کے برابر مربوط قوانین وضع کرتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر، اسلام کا نظریہ اپنے وضع کئے گئے قوانین سے معاشرہ کی حقیقی مصلحت کو پورا کرتا ہے، خواہ اکثریت کی مرضی کے مطابق ہو یا نہ۔ اور یہی قوانین ہیں کہ اسلام نے انھیں شریعت کا نام رکھا ہے اور انھیں قابل تغیر و تبدیلی نہیں جانتا ہے، کیونکہ ان کا محافظ انسان کی فطری خلقت ہے جو قابل تغیر نہیں ہے، اور جب تک انسان، انسان ہے اس کی فطری ضرورتیں ثابت اور پائیدار ہوں گی۔ اسلام اپنے ثابت قوانین (شریعت) کے علاوہ قابل تغیر ضوابط بھی رکھتا ہے اور وہ ایسے قوانین ہیں جو زندگی کی تبدیلیوں سے مربوط ہیں، تہذیب وتمدن کی پیشرفت کے اثر میں اور ان قابل تغیر قوانین کی شریعت کے قوانین سے نسبت، پارلیمنٹ کے قابل تنسیخ قوانین کی ناقابل تغیر آئین سے نسبت کے مانند ہے۔

اسلام نے دینی حکومت کے حاکم کو اختیار دیا ہے کہ شریعت کے قوانین کے سایہ میں، ضرورت کے وقت زمان اور شوریٰ کی مصلحت کے تحت ضروری فیصلے لے کر انھیں نافذ کرے اور یہ قوانین مصلحت کے تقاضوں کے مطابق اعتبار رکھتے ہیں اور مصلحت کے رفع ہونے پر منسوخ ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف شریعت کے قوانین قابل تنسیخ نہیں ہوتے۔

اس بناء پر مذکورہ بیان کے مطابق اسلام دو قسم کے قوانین رکھتا ہے: پہلے ثابت اور پائدار قوانین ہیں، جن کا ضامن انسان کی ثابت فطرت ہے اور انھیں شریعت کہا جاتا ہے۔

اور دوسرے وہ قوانین ہیں جو قابل تغیر ہوتے ہیں اور وقت کی مصلحت ان کی ضامن ہے۔ یہ قوانین مصلحت کے بدلنے کے ساتھ قابل تغیر ہوتے ہیں ،اس کے مانند کہ انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے سے بے نیاز نہیں ہے، لیکن قدیم زمانے میں مسافرت کے لئے یا پیدل چلتے تھے یا گھوڑے اور گدھے پر سوار ہو کر سفر کرتے تھے، ان کے لئے زیادہ قوانین اور ضوابط وضع کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن آج وسائل میں ترقی پیدا ہونے کی وجہ سے صحرائی، سمندری، زمین دوز اور ہوائی راستے نکلے ہیں اور بہت دقیق قوانین وضع کرنے کی ضرورت پیدا ہوئی ہے، یہاں پر واضح ہوتا ہے کہ یہ کہنا :''اسلام نے زمانہ کے گزرنے کو درک نہیں کیا ہے'' انتہائی بے بنیاد بات ہے۔

جن بات کو صاحب اعتراض کہہ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے ان احکام کی نشاندہی کر کے ثابت کرے جو اس زمانہ کی حقیقی مصلحت کے موافق نہ ہوں

یا حکم کی مصلحت کے بارے میں سوال کرے۔ یہ ایک وسیع بحث ہے ہم نے گنجائش کے مطابق اس کی وضاحت کی، اگر اس کے باوجود اس بحث کے بارے میں مزید کوئی ابہام باقی ہو یا کوئی اعتراض ہو تو تذکر دینا تاکہ بحث کو جاری رکھیں۔

دین اسلام کا فطری ہونا

سوال: کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ اسلام کے بہت سے قوانین جو زمان و مکان کے مطابق آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے وجود میں آئے ہیں، انھیں بدلنا چاہئے ؟

جواب: اس سوال کا جواب گزشتہ جواب میں واضح ہوا ہے۔ شریعت اسلام کے قوانین کی بنیاد انسان کی مخصوص فطرت و خلقت ہے نہ اکثریت (نصف اور ایک) کی رائے اور پسند۔ خدائے متعال فرماتا ہے :

)فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ..)(روم، ۳۰(

''آپ اپنے رخ کو دین (اسلام) کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارکش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور خلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے''...

کیا حضرت زینب (س) ولایت عہدی کے مقام پر فائز تھیں؟

سوال: کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا ولی عہدی کا مقام رکھتی تھیں؟ اور اگر رکھتی تھیں، تو کیا ان کے ذمہ دوسرے کاموں کے علاوہ اس کام کی ذمہ داری اس بات کی علامت نہیں ہے کہ اسلام میں عورت صلاحیت رکھنے کی صورت میں مرد کے قدم بہ قدم بڑھ سکتی ہے ؟

جواب: اس مسئلہ کے بارے میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور بنیادی طور پر اسلام میں ولی عہدی کے نام پر کوئی عنوان موجود نہیں ہے۔ اگر ولی عہد کا مقصود جانشینی ہو تو مستند مدارک کے مطابق تیسرے امامؑ کے جانشین چوتھے امامؑ ہیں نہ آپؑ کی خواہر گرامی حضرت زینب سلام اللہ علیہا۔

جی ہاں ! روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یزید اور بنی امیہ کی ظالمانہ اور استبدادی حکومت کے خلاف امام حسین علیہ السلام کی تحریک میں حضرت سید الشہداء کی وصیت کے مطابق حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے دوش مبارک پر بھاری ذمہ داریاں تھیں اور ان ذمہ داریوں کو نبھانے میں آپؑ نے علمی اور عملی لیاقت اور غیر معمولی دینی شخصیت کا مظاہرہ کیا۔ اصولی طور پر جاننا چاہئے کہ اسلام کی نظر میں، معاشرہ میں انسان کی قدر و قیمت علم و تقویٰ (دین کے انفرادی اور اجتماعی خدمات) پر ہے۔ اور معاشرہ میں دوسرے امور جو امتیاز اور نفوذ کا وسیلہ ہوتے ہیں، جیسے سرمایہ اور عظمت، خاندان اور خاندانی شرافت، حکومت اور عدلیہ کے عہدے اور فوجی عہدے کسی قسم کی قدر و منزلت اور امتیاز نہیں رکھتے ہیں، جو ان کے لئے فخر و مباہات کا سبب بن کر ان کو دوسروں پر افضل قرار دیں۔ اسلام میں طاقت کا نفوذ جتلانے کو کسی امتیاز کا معیار قرار نہیں دیا جانا چاہئے، اس بناء پر ایک مسلمان خاتون اپنے دینی امتیازات میں مرد کے قدم بہ قدم بڑھ سکتی ہے اور اگر لیاقت رکھتی ہو تو تمام مردوں سے آگے بڑھ سکتی ہے اور تین مسائل۔ حکومت، عدلیہ اور جنگ ۔ کے علاوہ تمام اجتماعی مشاغل میں مردوں کے دوش بدوش شرکت کر سکتی ہے۔ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے :

''بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار رہے ا'' اور فرماتا ہے :

''کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں ان کے برابر ہو جائیں گے جو نہیں جانتے ہیں؟ ۲ ''۔

ازدواج اور خاندان کی تشکیل

سوال: ازدواج اور خاندان کی تشکیل کے بارے میں اسلام کا کیا نظریہ ہے؟

جواب: ازدواج اور خاندان کی تشکیل اور اس کی بارے میں قوانین کے کلیات کو مدارک کے ساتھ بیان کرنے کی تفصیل وضاحت، اس مقالہ کی گنجائش سے باہر جو کچھ یہاں پر اس سلسلہ میں اختصار اور اجمال کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام ازدواج اور خاندان کی تشکیل کو انسانی معاشرہ کی پیدائش اور اس کی بقاء کا اصلی عامل جانتا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ تخلیق نے انسان کے افراد کے درمیان اجتماع برقرار کرنے کے لئے، انسان کو مردانہ اور زنانہ آلہ تناسل اور اس کے بعد جبلّی خواہشات سے مسلح کیا

۱۔(... انّ اکرمکم عنداللہ اتقکم ...)(حجرات، ۱۳)

۲۔(... ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون)(زمر، ۹)

ہے تاکہ یہ دونوں آپس میں نزدیکی پیدا کر کے دونوں کے مادہ میں موجود بچہ کو جنم دیں۔ اور اپنے لخت جگر کے بارے میں رکھنے والے جذبات اور ہمدردیوں کے پیش نظر حمل کے دوران اور پیدائش کے بعد اس نومولود بچہ کی پرورش کرتے ہیں اور ان کے رنج و غم اور جذبات سے بھرے یہ احساسات اور ہمدردیاں روز بروز بڑھتی ہیں۔ اس نومولود کی تربیت کر کے اسے بلوغ کے مرحلہ تک پہنچاتے ہیں۔ ماں باپ کے ان جذبات اور ہمدردیوں کے ردعمل کے طور پر بچہ بھی جذبات کا مظاہرہ کر کے اپنے ماں باپ سے رجحان دکھاتا ہے۔ اس طرح پہلے خاندانی اجتماع، پھر قومی اجتماع اور اس کے بعد شہری اور ملکی اجتماعات اور معاشرہ وجود میں آتے ہیں۔ بدیہی ہے کہ اس صورت میں معاشرہ کی بقاء اور اس کو نابود ہونے سے بچانے کے لئے جبلّی خواہشات محدود ہونی چاہئیں اور مرد کو اپنی قانونی بیوی اور عورت کو اپنے قانونی شوہر کے حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے تاکہ نومولود بچے کا باپ مشخص ہو (چونکہ عورت ماں ہونے کا فطری ضامن، رکھتی ہے اور وہ وضع حمل ہے) اگر یہ صورت نہ ہو تو ہر جوان اپنی مرضی سے اپنی جنسی خواہشات سے غیر قانونی طور پر استفادہ کر کے تشکیل خاندان کی محنت اور تکلیف سے پہلو تہی کریں گے اور اس طرح باپ اور فرزند اپنے نسبی روابط کے اطمینان کو کھو دیں گے، نتیجہ کے طور پر خاندانی ہمدردیاں کمزور پڑیں گی۔ آخر کار زنا رائج ہونے کے نتیجہ میں قہری طور پر حفظان صحت، اجتماعی، اخلاقی، قطع نسل اور دوسری بے شمار خیانتوں جیسی برائیوں۔ جو اس فحاشی کی پیداوار ہیں۔ سے خاندانی ہمدردیاں بالکل نابود ہو کر رہیں گی۔ جیسا کہ آپ مشاہدہ کر رہے ہیں کہ جن ملکوں میں جنسی آزادی ہے، وہاں پر خاندانی ہمدردیاں روز بروز نابود ہوتی جارہی ہیں اور یہ حالت انسان کے مستقبل کے لئے ایک خطرہ کی الارم ہے۔

چند سال پہلے ہم نے روزناموں اور مجلات میں پڑھا ہے کہ امریکہ میں مرد اور عورتوں کے ناجائز تعلقات کے نتیجہ میں سالانہ تین لاکھ بے باپ بچے متولد ہوئے ہیں، اس حالت کے پیش نظر ایک سو سال کے بعد معلوم نہیں انسانی معاشرہ کہاں پہنچ جائے گا! اسی لئے، اسلام نے زن و مرد کے جنسی تعلقات کو ازدواج کے علاوہ کسی اور راہ سے قطعی طور پر ممنوع کیا ہے اور بچہ کے اخراجات کی ذمہ داری مرد پر ڈال دی ہے اور اسے بچہ کی زندگی کا ذمہ دار اور مسؤل جانا ہے۔ اسلام میں قریبی رشتہ داروں کے درمیان ازدواج ممنوع ہے: جیسے ماں، پھپھی، خالہ، بہن، بیٹی اور بھائی اور بہن کی بیٹی مرد پر حرام ہے۔ اسی طرح بہو، ساس، بیوی کی بیٹی (ماں کے ساتھ آمیزش کرنے کی شرط پر) بیوی کی بہن (بہن کے عقد میں ہونے کی صورت میں) مرد پر حرام ہیں۔ اسی

طرح ہر شوہر دار عورت اور رضاعی رشتہ دار بھی نسبی رشتہ داروں کے مانند حرام ہوتے ہیں۔ عورت کے لئے بھی اسی نسبت سے مرد حرام ہوتے ہیں ۔مذکورہ بیان کے مدارک قرآن مجید کی وہ آیات ہیں جو سورہ نساء میں ذکر ہوئی ہیں اور اسی طرح وہ روایتیں بھی ہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام سے نقل کی گئی ہیں اور احادیث کی کتابوں میں درج ہیں۔

اسلام اور مسئلہ طلاق

سوال: اسلام کی نظر میں طلاق کیسی ہے؟

جواب: طلاق، اسلام کی مجلس قانون ساز کے فخر و مباہات میں سے ہے اور یہ ابدی بد بختی کو خاتمہ بخشنے والی چیز ہے کہ میاں بیوی کے درمیان عدم توافق کے نتیجہ میں رونما ہوتی ہے۔ اس قانون کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ غیر اسلامی حکومتیں بھی تدریجاً یکے بعد دیگرے اسے قبول کر رہی ہیں۔ اس کا ایک خلاصہ سوالات کے چوتھے حصہ کے جواب میں بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ص۔۱۷۵

طلاق، ضروریات اسلام میں سے ایک ہے اور اس کا مصدر بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ طلاق کے قوانین کی تفصیل اور ان کے مصادر بیان کرنے کی یہاں پر گنجائش نہیں ہے۔

عورت اور ہمسر کے انتخاب کا حق

سوال: کیا اسلام میں عورت، مرد کی طرح اپنے شریک حیات کو انتخاب کرنے کا حق رکھتی ہے یا نہیں؟

جواب: اسلام میں عورت اپنے شریک حیات کا انتخاب کرنے میں آزاد ہے۔

فرزند کا مرد سے متعلق ہونا

سوال: میاں بیوی کے درمیان طلاق کی صورت میں فرزند کس کا ہوتا ہے؟

جواب: مطلّقہ عورت حق رکھتی ہے کہ وہ اپنے بچہ کو سات سال تک خود پرورش کرے اور اس مدت کے دوران بچہ کی زندگی کا خرچ مرد کے ذمہ ہے ۔اس حکم کے مصدر کے بارے میں فقہ اسلام کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

حضرت علی علیہ السلام کی ایک فرمائش

سوال: کیا اسے مانتے ہو کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے: اپنے فرزندوں کو مستقبل کے لئے تربیت کرنا؟ اس صورت میں کیا اس فرمائش کا یہ معنی نہیں ہے کہ قوانین اسلام زمان و مکان کے مطابق بدلنے چاہئیں؟

جواب: یہ ایک مرسل حدیث ہے، کتاب نہج البلاغہ میں حضرت ؑ سے منسوب کی گئی ہے، اس کا مقصود یہ ہے کہ بچوں کی تربیت کو آداب و رسوم کی بنیاد پر انجام نہیں دینا چاہئے، کیونکہ روزمرہ کے آداب و رسوم کا جمود انسان کو زندگی کی ترقی سے روکتا ہے، جیسے کوئی شخص گھوڑے گدھے یا پیدل سفر کرنے کا عادی ہو اور اسی پر اکتفا کرے وہ کبھی گاڑی کو ایجاد کرنے اور سڑک کے اتار چڑھاؤ کو ہموار کرنے کی فکر میں نہیں پڑے گا۔

اس کا مقصود یہ نہیں ہے کہ اپنے فرزندوں کو شرعی قوانین (جو نص کے مطابق قابل تغیر نہیں ہیں) کا پابند نہ کریں اور اگر حقیقت میں یہی مقصود ہوتا تو ہم حدیث کو مسترد کرنے کے لئے ناگزیر تھے۔ کیونکہ ہمارے پاس پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام ائمہ اطہار علیہم السلام کا واضح اور قطعی حکم موجود ہے کہ جو بھی حدیث قرآن مجید کے مخالف ہو اسے مسترد کر کے قبول نہ کریں اور اس لحاظ سے ہر حدیث کا پہلے قرآن مجید سے موازنہ کرنا چاہئے

اور اس کے بعد اسے قبول کرنا چاہئے۔

شریعت کے احکام و قوانین میں خدا کے علاوہ کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا ہے

سوال: قوانین اسلام میں زمان و مکان کے مطابق تبدیلی لانے میں کیوں ہمیشہ کوتاہی کی ہے؟

جواب: دینی امور کے اولیاء خدائی قوانین (شریعت) میں تبدیلی لانے کا کسی قسم کا اختیار نہیں رکھتے ہیں اور ان کا فرض صرف دینی مسائل کے بارے میں کتاب و سنت سے استنباط کرنا ہے، ایک وکیل کے مانند جو قانونی مسائل کو ملک کے آئین سے استنباط کرتا ہے نہ یہ کہ آئین کے کسی دفعہ میں تبدیلی لائے۔

شرعی قوانین کے بارے میں علمائے دین کی بات ہی نہیں، خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ جو شریعت کے لانے والے ہیں۔ اور آپؐ کے جانشین۔ جو امام اور شریعت کے محافظ اور معلم ہیں۔ بھی تبدیلی لانے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اس قسم کے سوالات اور اعتراضات کا سرچشمہ مغربی عمرانیات کے ماہروں کا طرز تفکر ہے، جو یہ کہتے ہیں: صاحب شریعت انبیاء چند نوابغ اور اجتماعی مفکرین تھے، جنہوں نے معاشرہ کے حق میں انقلاب برپا کرکے لوگوں کی سیدھے راستہ کی طرف دعوت کی ہے اور اقتضائے زمان کے مطابق اپنی فکر سے کچھ قوانین کو وضع کرکے لوگوں کو سکھایا ہے اور خود کو خدا کے رسول، اپنے مقدس افکار کو آسمانی وحی اور خدا کا کلام اور شریعت و خدا کا دین اور اپنے بے لاگ افکار کے سرچشمہ کو فرشتہ وحی، جبرئیل بیان کیا ہے۔

بدیہی ہے کہ اس قسم کے نظریہ کے مطابق، ادیان آسمانی کے قوانین من جملہ شریعت اسلام اقتضائے زمان کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں اور ان چالیس سوالات ا کے دوران پیدا ہونے والے اعتراضات بجا ہونے چاہئیں۔

لیکن یہ صاحبان نظر اپنے نظریہ میں خطا کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اور بجائے اس کے بغیر کہ پیغمبروں کے دعویٰ کی تحقیق کریں، بے بنیاد فرض پر فیصلہ سنادیا ہے۔ اگرچہ دوسری آسمانی کتابوں کی سند اور گزشتہ پیغمبروں کی زندگی کی تاریخ ابہام اور تاریکی

سے مبرّا نہیں ہے، لیکن قرآن مجید کا متن، جو اسلام کی آسمانی کتاب ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے

ا۔ جدید طبع میں سوالات کو مرتب کرنے کے بعد ان کی تعداد کم ہو کر ۳۳ رہ جاتی ہے۔

جانشینوں کے موجودہ قطعی الصدور بیانات اس نظریہ کو جھٹلا کر مسترد کرتے ہیں۔

ہم اس وقت اسلام کی طرفداری یا اس کی حقانیت کا دفاع کرنا نہیں چاہتے، لیکن جو شخص اس دین کے مصادر کے بارے میں تھوڑی سی آشنائی بھی رکھتا ہو، قرآن مجید اور اولیائے دین خاص کر اس کتاب کو لانے والے پیغمبرؐ کے بیانات پر سرسری نگاہ ڈالے تو اسے معلوم ہوگا کہ وہ اس نظریہ کو مکمل طور پر مسترد کرتے ہیں۔

قرآن مجید واضح الفاظ میں فرماتا ہے:

"پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین خدا میں کسی قسم کا اختیار اور عمل کی آزادی نہیں رکھتے ہیں اور وہ صرف خدا کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔" (مائدہ ۹۹، ۹۲)

واضح طور پر فرماتا ہے:

''دین خدا بشری فکر کی پیداوار نہیں ہے بلکہ یہ ایسے احکام و قوانین ہیں جنھیں پروردگار عالم نے اسے پیغمبروں کے توسط سے اپنے بندوں پر نازل فرمایا ہے''

(حاقہ، ۴۰۔ ۴۳)

جو لوگ یہ کہتے تھے کہ قرآن مجید پیغمبر کا کلام ہے اور آپؐ سے خدا سے نسبت دیتے ہیں، ان کے جواب میں قرآن مجید واضح طور پر فرماتا ہے:

''بیشک قرآن خدا کا کلام ہے اور انسان کا کلام نہیں ہے اور نہ اس کے مضامین انسانی فکر کی پیداوار ہیں۔ ۱''

مزید فرماتا ہے:

''پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد آسمانی وحی اور نبوت نے خاتمہ پایا ہے

۱۔ (مدثر، ۲۵)

اور قرآن کے احکام قیامت تک معتبر اور ناقابل تنسیخ ہیں ۱''

گزشتہ مطالب کے پیش نظر جو شخص اسلام کے قوانین کے ایک حصہ کو روز مرہ زندگی سے ناقابل تطبیق تشخیص قرار دے، اسے اسلام کی حقانیت کی بنیاد ۔جو ابدی احکام اور قوانین کو بیان کرتا ہے۔ پر اعتراض کرنا چاہئے اور ان میں تبدیلی لانے کی چارہ جوئی کرنی چاہئے۔

اسلام اور ترقی یافتہ قوانین

سوال: کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے دین سے منہ موڑنے کی ذمہ داری ان پس ماندہ قوانین پر ہے جو موجودہ زمانہ میں دنیا کی صنعت و علم کے مطابق نہیں؟

جواب: بہتر تھا اگر آپ ان بے بنیاد دعاوی کے بجائے اسلام کے پس ماندہ قوانین کے چند نمونے پیش کرتے تاکہ اس پر مدلّل بحث کی جاتی۔ اسلام میں پس

ماندے قوانین نہیں ہیں لیکن قوانین سے پیچھے رہ جانے والے مسلمان بہت ہیں!

آسمانی ادیان، خاص کر دین اسلام انسان کی ایک ابدی ازلی زندگی اور انسانی زندگی کے ماورائے طبیعت سے رابطہ کی بحث کرتے ہیں اور اس طرز کی بحث کا آج کے علم و صنعت سے کیا رابطہ ہے؟ آج کل کے علم کی بحث کا موضوع مادّہ اور مادّہ کی خصوصیات ہے اور آج کی صنعت بھی مادہ کے بارے میں سرگرم ہے۔ اس لحاظ سے ماوراء کے بارے میں اسے مسترد یا قبول کرنے کے سلسلہ میں اظہار نظر کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

۱۔ (احزاب، ۴۰)

ہمارے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے دین سے منہ موڑنے کا گناہ دینی قوانین پر نہیں ہے اور اس مطلب کا گواہ کہ انسان نے نہ صرف دین سے روگردانی کی ہے بلکہ واضح ہے کہ ضمیر اور انسانیت کے قوانین کو بھی پائمال کر رہا ہے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جھوٹ، خیانت، چاپلوسی، بے حیائی اور بے راہ روی کا اس ہونا ہے کہ وہ ہر قسم کی پاکی، سچائی اور حق کے دشمن ہیں، نہ صرف دین کے۔

دوسری طرف سے، تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد (اگرچہ دوسروں کی نسبت کم ہے) پسندیدہ اخلاق سے آراستہ اور معارف سے آشنا اور ان ہی (بقول آپ کے) پسماندہ قوانین! کے پابند اور ان پر عمل کرتے ہیں اور چونکہ اسلام ہرگز علم و صنعت کے منافی نہیں ہے، اس لئے یہ لوگ اپنی زندگی

میں رنج وناراحتی کاہر گزاحساس نہیں کرتے۔ لہذا حقیقت میں ہمارے نوجوانوں کی دین سے رو گردانی کی ذمہ داری ہمارے فریضہ ناشناس ثقافتی مسؤلین کی ثقافتی تعلیم وتربیت کے طریقہ کار پر ہے نہ دینی قوانین پر اور نہ انسانی فضائل اور اخلاقی قوانین پر۔

فحاشی اور منکرات کا قبیح ہونا

سوال: فحاشی۔ جس میں مرد اور عورتیں برابر شریک ہیں۔ کے بارے میں عورتوں کی کیوں زیادہ ملامت کی جاتی ہے ؟ اور اگر آپ قبول کرتے ہیں کہ مرد، ایک بہتر اور طاقتور تر مخلوق ہے، اس صورت میں وہ اپنے اعمال کو بہتر کنٹرول کر سکتا ہے اور اگر ایسا نہ کرے تو اس کی زیادہ سرزنش کی جانی چاہئے ؟

جواب: اسلام میں ایسے کسی حکم کا وجود ہی نہیں ہے۔

ایک ناشائستہ بات

سوال: کہا جاتا ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے: اگر کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا دو گے تو اس کے ساتھ اپنے حقیقی بیٹے کا جیسا برتاؤ کرنا چاہئے کیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں ؟ صحیح ہونے کی صورت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے منہ بولے بیٹے کی طلاق دی گئی بیوی سے شادی کرنے پر کیوں آمادہ ہوئے ؟

جواب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ہر گز ایسی کوئی تاکید نہیں کی گئی ہے، بلکہ یہ ایک تہمت ہے جو اسلام کے دشمن خاص کر مغربی عیسائی آپ پر لگاتے ہیں۔ اپنے منہ بولے بیٹے کی طلاق دی گئی بیوی سے آنحضرت ؐ کی شادی اسی اصول پر تھی کہ اس ناپسند رسم کو باطل کر کے اس کا اعلان فرمائیں، کیونکہ اس زمانہ میں اکثر ممالک میں ایک خاندان کے کسی فرزند کو دوسرے خاندان سے ملحق کر کے اس کے ساتھ حقیقی رشتہ کا برتاؤ کیا جاتا تھا ۔اس سلسلہ میں قرآن مجید کے سورہ احزاب میں کئی آیتیں موجود ہیں۔

ازدواج میں عمر معیار نہیں ہے

سوال: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بشر کی تربیت کے لئے ایک عظیم مقام پر فائز تھے اور آپ ؐ کے اعمال دوسروں کے لئے نمونے ہونے چاہئیں آپ ؐ نے کیوں تقریباً بوڑھاپے میں ایک نو سالہ لڑکی (عائشہ) سے شادی کی ؟

جواب: اگر جوان عورت کی ایک بوڑھے مرد سے شادی کرنے میں کوئی عیب ہو تو، یہی ہو گا کہ ایک جوان عورت کے لئے ایک بوڑھے مرد سے مباشرت کرنی لذت بخش نہیں ہوتی یا یہ کہ عمر کے عدم تعادل اور تقارب کی وجہ سے عام طور پر شوہر عورت سے پہلے مر جاتا ہے اور عورت جوانی میں بیوہ ہوتی ہے۔ لیکن واضح ہے کہ ازدواج کے مقاصد صرف ان دو مقاصد تک محدود نہیں ہیں اس لئے ہمارے پاس اس رویہ کے ممنوع ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے ممکن ہے مذکورہ مقاصد سے بہت اہم دوسرے مقاصد بھی ہوں جو اس قسم کی شادی کے لئے ترجیح کا سبب بنیں۔

جیسا کہ ہم نے اخباروں میں پڑھا ہے کہ چند سال پہلے، امریکہ کے صدر جمہوریہ مسٹر آئزن ہاور نے امریکہ کے کثیر الاشاعت اخباروں میں یہ ایک سوال پیش کیا تھا اور ملک کی دوشیزگان سے پوچھا تھا کہ تم کس سے شادی کرنا پسند کرتی ہو ؟ امریکہ کی اکثر دوشیزگان نے اپنے جواب میں خود مسٹر آئزن ہاور کا نام لیا تھا، جبکہ نہ وہ جوان تھا اور نہ خوبصورت۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شادی کے بارے میں، جو شخص آنحضرت ؐ کی زندگی کی تاریخ کے بارے میں کم وبیش اطلاع رکھتا ہے، بخوبی جانتا ہے کہ آپ ؐ ایک شہوت پرست اور عیّاش مرد نہیں تھے اور آپ ؐ کے ہر کام استدلال کی بنیاد پر ہوا کرتے تھے نہ جذبات کی بنا پر، آنحضرت ؐ نے اس قسم کا کام جواز کے بیان کے لئے انجام پایا ہے اور آپ ؐ کی دعوت اسلام کی پیشرفت میں اس کے نمایاں اثرات رونما

ہوئے ہیں۔

اسلام میں متعہ کا مشروع و جائز ہونا

سوال: ''متعہ'' کے حکم کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے، جبکہ اہل سنت اس کے مخالف ہیں اور اس عمل کا مقصود کیا ہے؟ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ یہ امر انسانی قوانین کے خلاف ہے اور عورت کو (اگر انسان کی حیثیت سے قبول کرتے ہو) ایک ایسی چیز بناتا ہے تا کہ آسانی کے ساتھ اس کا ناجائز فائدہ اٹھایا جائے؟

جواب: نکاح متعہ کی مشروعیت و شرعی جواز قرآن مجید کے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۲۴ میں ثابت ہو چکا ہے اور شیعہ اس کے بارے میں اہل سنّت کی مخالفت پر اعتنا نہیں کرتے، کیونکہ یہ عمل قرآن مجید میں ثابت ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی میں، خلیفہ اول کی خلافت کے دوران اور خلیفہ دوم کی خلافت میں بھی ایک مدت تک معمول کے مطابق رائج تھا اور اس کے بعد خلیفۂ دوم نے اس کو منع کیا اور واضح ہے کہ قرآن مجید کے حکم کو صرف قرآن مجید ہی تنسیخ کر سکتا ہے اور اسلامی حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ موزون (شریعت کے) قوانین کے بارے میں اظہار نظر کرے۔

نکاح متعہ کا مقصود، موقت ازدواج ہے اور اسلام کی نظر میں اس کی مشروعیت و شرعی جواز مذکورہ بیانات کے مطابق ناقابل انکار ہے۔ فلسفہ احکام کے نقطہ نظر کے مطابق طلاق کی مشروعیت و شرعی جواز اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ازدواج، موقت بھی انجام دیا جا سکتا ہے، اس صورت میں کہ موقّت ازدواج آثار کے لحاظ سے اس طرح مرتب ہو جائے کہ نقصانات اور مضر نتائج کا سبب نہ بنے، تو اس کو ممنوع کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ''یہ عمل عورت کو ایک ایسی چیز بنا دیتی ہے جس سے مرد آسانی کے ساتھ ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے'' ایک زبردستی اور ظلم ہے، کیونکہ عورت اس عمل کو اپنے اختیار سے قبول کرتی ہے نہ جبر و اکراہ سے اور اس عمل میں جو مقاصد مرد کے لئے فرض کئے جا سکتے ہیں اور وہ مقاصد اگر مصاحبت، لذت، اولاد پیدا کرنا اور زندگی کے دوسرے فوائد ہیں تو یہ دونوں طرف موجود ہیں، اس لئے کوئی دلیل نہیں ہے کہ دو میں سے کسی ایک کو دوسرے کا کھلونا شمار کیا جائے۔

اس کے علاوہ اگر آپ عالم بشریت پر عام اور وسیع نظر ڈال کر سنجیدگی سے غور کریں گے تو واضح طور پر مشاہدہ کریں گے کہ انسانی معاشرہ کی جنسی آمیزش کو نکاح اور دائمی ازدواج تک محدود کر کے ہر قسم کی دوسری آمیزش کو غیر قانونی شمار نہیں کیا جا سکتا ہے اور ازدواج دائمی کا رواج ہرگز اس جنسی جبلّت کو پورا کر کے مناسب جواب نہیں دے سکتا ہے۔

مہذب دنیا کے کسی بھی ملک میں قانونی حکومتیں کسی بھی ذریعہ سے موقت آمیزشوں کے پھیلاؤ پر کنٹرول نہیں کر سکی ہیں اور تمام بڑے اور مرکزی شہروں میں آشکار یا مخفیانہ صورت میں یہ عمل انجام پاتا ہے۔ اس صورت میں جو مذہب جنسی آمیزش کو ازدواج تک محدود کر کے مکمل طور پر زنا کو روکنا چاہے، تو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ موقت ازدواج کو زنا کے مفاسد کو رفع کرنے کے خاص شرائط سے قانون میں جگہ دے تا کہ اس عمومی جبلّت کا خاطر خواہ طریقہ سے کنٹرول کر سکے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: ''اگر خلیفہ دوم اس نکاح متعہ (موقعت ازدواج) کو ممنوع نہ کرتے تو صرف وہ لوگ زنا میں گرفتار ہوتے جو گمراہی سے ہلاکت تک پہنچ گئے ہوں) اور یہاں پر واضح ہوتا ہے کہ اس امر کو انسانی قوانین کے خلاف شمار کرنا کس قدر حقیقت سے دوری ہے۔

البتہ انسانی قوانین کا مقصود قبل از اسلام قدیم قوانین، جیسے قدیم رومی اور حمورابی کے قوانین نہیں ہیں، کیونکہ ان قوانین میں عورت سے حیوانوں یا اسیروں جیسا سلوک کیا جاتا تھا، بلکہ ان سے مراد مغربی قوانین ہیں اسی عالم غرب کو انسانی دنیا، مغربی معاشرے کو انسانی معاشرہ اور غربیوں کو انسان جانتے ہیں اور ہر قسم کے اوامر سے متاثر ہو کر (حقیقت ذہنی، تلقین، تقلید، تبلیغ، خطا) فی الحال یہی فکر کسی قید و شرط کے بغیر ہمارے ذہنوں پر حکمراں ہے ۔لیکن دیکھنا چاہئے کہ ان فخر کرنے والے انسانوں نے ازدواج کے ماحول سے باہر، عمومی اور مخلوط معاشرتوں میں اس (انسانی قوانین کے خلاف) کی جگہ پر کیا رکھا ہے اور مہذّب ممالک خاص کر سب سے مہذب ممالک میں مردوں او عورتوں، لڑکوں اور کنواری لڑکیوں اور خود مردوں اور جوانوں کے درمیان کیا گزر رہی ہے ؟اور دائمی ازدواج کی راہ سے جو کمی واقع ہو رہی ہے اسے کس طریقہ سے پورا کرتے ہیں ؟اور اس سلسلہ میں شائع ہونے والے حیرت انگیز اعداد و شمار کس بات کی غمّازی کرتے ہیں ؟

مسلمانوں کی کمزوری کا اسلام سے کوئی ربط نہیں ہے

سوال: غربیوں کا اعتقاد ہے کہ اسلام صرف سادہ لوگوں جیسے کسان، صحرا نشین اور آج کل کی مشینی تمدن سے پیچھے رہ جانے والوں کا دین ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان ممالک میں سے ایک ملک بھی ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں نہیں ہے اور اسلام نے صنعتی اور متمدن ممالک میں اصلاً کسی قسم کی پیشرفت نہیں کی ہے۔اس کا سبب کیا ہے ؟ کیا آپ سوچتے ہیں کہ اسلامی قوانین کو اس طرح تبدیل کیا جائے یا ترجمہ کیا جائے جو تعلیم یافتہ افراد کے لئے قابل قبول ہوں اور علم کے موافق ہوں ؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلامی ممالک ترقی یافتہ اور پیشرفتہ ممالک کی فہرست میں نہیں ہیں۔لیکن دیکھنا چاہئے اسلامی ملک کا نام رکھنے والے ممالک میں سے کس ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہیں ؟اس کے علاوہ یہ کہ ان پر دین اسلام کا نام لگایا گیا ہے اور اس نام کا انہیں کیا فائدہ مل رہا ہے ؟بجز اس کے ان ممالک میں کچھ لوگ بعض اسلامی عبادتوں، جیسے نماز، روزہ اور حج کو دیرینہ عادت کے طور پر بجالاتے ہیں، یہ لوگ اسلام کے انفرادی ،اجتماعی، تغیراتی اور عدلیہ کے کن قوانین پر عمل کرتے ہیں ؟اس صورت میں کیا یہ مذاق نہیں ہے کہ اسلامی ممالک کے تنزّل کا ذمہ دار اسلام کو ٹھہرایا جائے ؟

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اگر اسلام ایک ترقی یافتہ دین ہوتا اور اس کے قوانین معاشرے کی اصلاح اور ادارہ کرنے کی لیاقت رکھتے، تو اس نے معاشرے میں اپنے لئے کوئی جگہ بنالی ہوتی اور اس طرح متروک نہ ہو چکا ہوتا !

لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر معاشرہ میں عدم ترقی اور تنزل کا سبب اسلامی قوانین ہیں تو، مغربی ترقی یافتہ ڈیموکریسی کی روش، جو نصف صدی سے ان ممالک میں رائج ہے، نے اپنے لئے کیوں کوئی جگہ نہیں بنائی ہے اور اپنی پیشرفت میں کسی قسم کا اثر نہیں دکھایا ہے اور ظاہر نمائی کے علاوہ کوئی اثر نہیں رکھتی ؟اور مشرقی لوگ غربیوں کے مانند اس ترقی یافتہ روش سے کیوں فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں ؟اور کیوں یہی انسانی نظام ''ڈیموکریسی''جو برسوں سے انسانیت کے گہوارہ ''مغرب'' میں اپنے لئے جگہ بنا سکا تھا اور معاشرہ کی رگوں میں خون کی جگہ جاری تھا، کمیونزم کی آواز کو خاموش نہ کر سکا ہے، یہاں تک نصف صدی سے کم عرصہ میں کمیونسٹ نظام نے کرۂ ارض کی تقریباً نصف آبادی پر اپنا تسلط جمایا اور حتی یورپ اور امریکا کے مرکز میں بھی نفوذ کیا اور ہر روز ایک نئے مورچہ کو ان ہی ترقی یافتہ انسانوں (غربیوں) سے فتح کرتا جارہا ہے کیا اسی دستاویز کی بناپر یہ نظریہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ کیمونزم کے ترقی یافتہ قوانین اور اس کا نظام یا ڈیموکریسی کے قوانین اور اس کا نظام، بدبختوں اور صحرا نشینوں کی روش ہے ؟

اس کے علاوہ، زوال اور پس ماندگی سے صرف مسلمان ممالک دوچار نہیں ہیں تاکہ اسے اسلام کی گردن پر ڈال دیا جائے بلکہ ایشیاء اور افریقہ کے تمام ممالک، من جملہ برہمن اور بدھ مذہب سے لے کر مسحیت اور اسلام سے تعلق رہنے والے لوگ رہتے ہیں، اسی بد قسمتی سے دوچار ہیں۔ یقیناً ایشیا اور افریقہ کے قدرتی دولت سے مالا مال ان دو براعظموں کا گناہ یہ ہے کہ مغربی دنیا اور ان کے بے حد طمع و لالچ کے شکار ہوئے ہیں تاکہ یہ دو بے نیاز براعظم اپنے منابع سے مغربی صنعتوں اور ان کے بازار کے لئے خام مال کا ذخیرہ مہیا کر سکیں اور غلاموں کی یہ دنیا بدون چون وچرا مغرب کی محتاج رہے۔ ان حالات کے پیش نظر یہ ممالک کبھی ترقی یافتہ ممالک (یعنی مغربی ممالک) کا جز نہیں بن سکتے ہیں اور ان ممالک کے باشندے، خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان، کبھی اپنے آقاؤں سے ملحق نہیں ہوں گے جیسا کہ آج تک ہم نے دیکھا ہے، یہ لوگ ""غربی"" کبھی ""استعمار""، کبھی ""استملاک"" کبھی ""اشتراک منافع"" اور کبھی ""اقتصادی امداد"" کے نام پر ہم پر سوار ہوتے رہیں گے۔

سوال کے ذیل میں جو یہ کہا گیا ہے کہ کیا اسلام کو اس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے یا توجیہ کی جا سکتی ہے تاکہ تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے قابل قبول ہو اور علم کے موافق ہو؟ چنانچہ بیان ہوا، معارف اسلامی۔ جن کی ضمانت کتاب و سنت دیتی ہے۔ واضح طور پر ہر گز قابل تغیر نہیں ہے چنانچہ اسلام دین حق ہے اس لئے اسے ضرورت ہی نہیں کہ تعلیم یافتہ طبقہ اسے قبول کرے، بلکہ مذکورہ طبقہ ہی حق اور حقیقت پسندی کا محتاج ہے،

خدائے متعال فرماتا ہے:

""دین میں کسی قسم کا جبر واکراہ نہیں ہے اور سیدھا راستہ واضح ہے ۱""

ہم پھر یہی بات کہتے ہیں کہ ""اسلام کی علم سے مخالفت"" کو ثابت کرنے کے لئے چند نمونے پیش کئے جاتے تاکہ ""اسلام علم کا مخالف ہے"" کے صرف دعویٰ کی دلیل بھی پیش کی جاتی اور اسی خالی دعویٰ پر اکتفا نہ کرتے۔

قانون اور عدالت کے سامنے سب مساوی ہیں

سوال: کیا آپ یہ بات مانتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے: ایک انسان کی قدر و منزلت اس کے اعمال اور کردار پر منحصر ہے نہ اس پر کہ وہ کس کا فرزند ہے یا کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے یا کس رنگ کا ہے؟ اس بناء پر شیعہ حضرات کیوں حضرت علی علیہ السلام یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کو نسل در نسل دوسروں سے بہتر و پاک تر جانتے ہیں؟

جواب: اسلام کی نظر میں قانون اور عدالت کے سامنے سب برابر ہیں اور اس جہت سے شاہ و گدا، امیر و غریب، طاقت ور اور کمزور، مرد اور عورت، سیاہ فام اور سفید فام، حتی پیغمبر وامام۔ کہ معصوم ہیں۔ اور تمام لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور کسی بھی استثناء اور امتیاز سے کسی پر دباؤ ڈال کر اس کی قانونی آزادی سلب نہیں کی جا سکتی ہے۔ سادات کے احترام کی بنیاد قرآن مجید کی ایک آیہ شریفہ ہے جس کے موجب خدائے متعال اپنے پیغمبرؐ حکم فرماتا ہے کہ لوگوں سے تقاضا کریں کہ آپکےؐ رشتہ داروں سے دوستی اور مودّت کا معاملہ کریں ۲۔

۱۔(لا اکراہ فی الدین قد تبیّن الرّشد من الغی...)(بقرہ ۲۵۶ (

۲۔(... قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودّۃ فی القربیٰ)(شوریٰ ۲۳(

اس تقاضا کا راز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد واضح ہوا اور لوگوں نے آپؐ کی اولاد سے ایک ایسا برتاؤ کیا کہ تاریخ میں کسی رہبر اور

پیشواکی نسل کے ساتھ نہیں کیا گیا ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد صدیوں تک سلسلۂ سادات کسی صورت میں محفوظ نہیں تھا ،وہ قتل کئے جاتے تھے،ان کے تن سے جدا کئے گئے اوران سروں کوایک شہر سے دوسرے شہر میں تحفہ کے طور پر بھیجا جاتا تھا،انھیں زندہ زمین میں دفناتے تھے، گروہ گروہ کی صورت میں عمارتوں اور دیواروں میں چنے جاتے تھے،سالہاسال تک زندان کی کالی کوٹھریوں میں انھیں جسمانی اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں،اورانھیں زہر دیا جاتا تھا۔ہجرت کے بعد صدیاں گزر کر شیعوں نے تھوڑی سی آزادی حاصل کی اوراولادرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوران کے دوستوں پر ہونے والے مظالم کے مقابلہ میں ردعمل دکھاکر سادات کااحترام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلام میں سور کے گوشت کے حرام ہونے کافلسفہ

سوال: سور کا گوشت کھانااسلام میں کیوں حرام ہے؟

جواب: سور کا گوشت صرف اسلام میں ہی حرام نہیں ہے بلکہ جیسا کہ انجیل اور تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ سور کا گوشت اسلام سے پہلے آسمانی ادیان میں بھی حرام تھا۔اس کے گوشت کے حرام ہونے کے بارے میں جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے وہ حفظان صحت کے لئے نقصانات اوراس کانجاست خوار ہونا ہے۔

اسلام میں مست کرنیوالی چیزوں کے حرام ہونے کافلسفہ

سوال: اسلام میں شراب کیوں حرام ہے؟

جواب: اسلام نے اپنی تعلیم وتربیت کی بنیاد استدلال پر رکھی ہے جو تمام حیوانات پر انسان کا امتیاز ہے اور واضح ہے کہ شراب اور دوسری مست کرنے والی چیزیں انسان کی زندگی کے اس بنیادی امتیاز کو ضائع کردیتی ہیں اوراستثنا کے بغیر دینی تعلیم وتربیت کے مقاصد کو نابود کرکے رکھتی ہیں۔

مختلف قسم کے ظلم وتعدّی، قانون کی خلاف ورزیوں اور بے راہ رویوں کا، شراب تنہاعامل یاان میں شریک ہے اوراسی طرح حفظان صحت،روح اور جسم کو پہنچنے والے نقصانات اور موروثی برے اثرات جو روزمرہ دنیا میں پیدا ہوتے ہیں، شراب کے سبب سے ہیں،ان سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی ہے ا۔

مرداورعورت کے درمیان جائزاور ناجائز تعلقات

سوال: اسلام عشق اور زن ومرد کے درمیان جنسی تعلقات کے بارے میں کیا نظریہ رکھتا ہے؟

ا۔(یاایّھاالذین امنوا انّماالخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون *انّمایرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکراللہ وعن الصلوۃ فھل انتم منتھون)(مائدہ۹۰۔۹۱(

ایمان والو! شراب،جوا،بت، پانسہ،یہ سب گندے شیطانی اعمال ہیں لہذاان سے پرہیز کروتا کہ کامیابی حاصل کرسکو۔شیطان توبس یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے بارے میں تمہارے درمیان بغض اور عداوت پیدا کرے اور تمھیں یاد خدااور نماز سے روک دے تو کیا تم واقعاًرک جاؤگے؟

جواب:ازدواج کے ماحول سے باہر،(جیسا کہ بیان ہوا) عاشقانہ تعلقات،خواہ آمیزش کے لئے ہوں یااس کے مقدمات کے طور پر،اسلام میں ممنوع اور حرام ہیں۔اور بنیادی طور پر جاننا چاہئے کہ اسلام میں حرام کافلسفہ طبقات کی آزادی کو سلب کرنے کامسئلہ یا دوسروں کا حق چھینااور ظلم کرنا نہیں ہے ۔البتہ اگرزن ومرد کواپنی مرضی سے کسی کے حقوق میں رکاوٹ اور ظلم کئے بغیر بھی آزادی کے ساتھ ہرکام انجام دینے کی اجازت ہوتواس میں اور زنا

کے اقسام میں کوئی فرق نہیں ہے، ایسے اعمال ممنوع ہیں اور اس حساب سے لواط بھی زنا کے مانند ہے۔

اسلامی احکام کا نا قابل تغیر ہونا

سوال: کیا کلّی طور پر آپ اس بات کے معتقد ہیں کہ قوانین اسلام قابل تغیر و تبدیل ہیں یا نہیں؟ اور کیا ان تغیرات کے بارے میں آپ معتقد ہیں کہ اس سلسلہ میں دینی قائدین کو پیش قدم ہونا چاہئے یا تغیرات رونما ہونے کی صورت میں ان کے ساتھ ہم آہنگی کریں؟

جواب: چنانچہ پہلے بیان ہوا کہ شریعت کے قوانین (خدا کے ثابت احکام) کسی صورت میں قابل تغیر نہیں ہیں اور دین کے قائدین کو پیش قدم ہونے یا پیچھے ہٹنے یا کسی مورد میں موقت یا غیر موقت سازش کرنے کے لئے کسی قسم کا اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ خدائے متعال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتا ہے:

''اور اگر ہماری توفیق خاص نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ (بشری طور پر) کچھ نہ کچھ ان کی طرف ضرور مائل ہو جاتے۔ اور پھر ہم زندگانی دنیا اور موت دونوں مرحلوں پر دہرا مزہ چکھاتے اور آپ ہمارے خلاف کوئی مددگار اور کمک کرنے والا بھی نہ پاتے ا۔''

دین کے احکام کا قرآن وسنّت کی بنیاد پر قابل قبول ہونا

سوال: کیا آپ ذاتی طور پر اسلام کے تمام قوانین اور رسومات پر کسی قسم کے چون وچرا کے بغیر اعتقاد رکھتے ہیں؟

جواب: مسلمانوں میں پیدا ہوئے آداب ورسوم اگر کتاب وسنت سے کوئی ماخذ نہ رکھتے ہوں تو ان کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے۔ لیکن شریعت کے قوانین جو کتاب وسنت میں قطعی مدرک رکھتے ہیں، انھیں قبول کرنا واجب ہے اور ان کی مخالفت کرنا جائز نہیں ہے۔

مولا علی علیہ السلام کے کلام کی وضاحت

سوال: حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے: ''اپنے ماں باپ کے لئے مسلمان نہ ہو جاؤ، بلکہ اس لئے مسلمان ہو جاؤ کہ تم خود اس کا ایمان پیدا کر کے اسے قبول کرو گے جتنا ہو سکے اپنی عقل سے قبول کرو۔'' اس صورت میں کیا آپ نہیں سمجھتے کہ ہر مسلمان اس حق کی آزادی رکھتا ہے کہ قوانین اسلام میں سے جسے پسند کرے اسے قبول کرے اور باقی قوانین کو اگر عقل سے قبول نہیں کر سکتا ہو تو انھیں چھوڑ دے؟

جواب: حضرت علی علیہ السلام کا یہ کلام اسلام کے اعتقادی معارف کے بارے میں ہے

ا۔(ولولاان ثبتناک لقد کدتّ ترکن الیهم شیئاًقلیلا * اذاًلاذ قناک ضعف الحیاۃ وضعف الممات ثم لا تجد لک علینا نصیرا)(اسراء، ۷۴۔۷۵(

کہ ان پر عقل کی راہ سے ایمان لانا چاہئے، نہ عملی قوانین کے بارے میں کہ ان پر عمل کرنا ضروری ہے قوانین پر عمل کرنے میں امتیاز برتنا بے معنیٰ ہے۔ صرف قوانین اسلام میں ہی امتیاز برتنا جائز نہیں ہے بلکہ دوسرے اجتماعی قوانین کی بھی یہی حالت ہے ان میں امتیاز برتنا ایک تشکیل یافتہ معاشرہ کو نابود کرنے کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں دیتا۔ مثلاً جس ملک میں ڈیموکریسی کا نظام حکم فرما ہو تو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی ہے کہ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کو اس بات کی آزادی ہوگی کہ قوانین کے ان دفعات کو قبول نہ کریں جو ان کی عقل کے ساتھ سازگار نہ ہوں اور نتیجہ کے طور پر لوگوں کا ایک گروہ مالیات سے مربوط قوانین کے دفعات پر عمل نہیں کرے گا اور کچھ لوگ تجارت سے مربوط قوانین کو، کچھ لوگ تعزیراتی قوانین کو اور کچھ لوگ انتظامات سے مربوط قوانین کو چھوڑ دیں گے تو بدیہی ہے اس قسم کے حالات معاشرہ میں ہرج ومرج پیدا کر کے اسے نابود کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس، ہر فرد ڈیموکریسی کا نظام کو قبول کرتا ہے اور مجلس قانون ساز کے نمائندہ کو انتخاب کر کے قانون کے تمام دفعات کو قبول کرتا ہے اور قانون کے ہر دفعہ کو

ناقابل تردید جانتا ہے۔

اسی طرح اسلام میں جس شخص نے عقل کی راہ سے اسلام کے اعتقادی معارف کو قبول کیا،اس نے اس کے ضمن میں نبوت کی حقانیت کی تصدیق کر کے ایمان لایا ہے کہ جو قوانین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے ہیں اور ان کی خدا سے نسبت دی ہے،وہ ایسے قوانین ہیں جن کو وضع کرنے والا حقیقت میں خدائے متعال ہے اور خدائے متعال ہر گز اپنے قوانین میں غلطی اور خطا نہیں کرتا ہے اور اپنے بندوں کے منافع کے تحفظ اور ان کی مصلحت کی رعایت کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں رکھتا ہے،البتہ جو شخص اس قسم کا اجمالی ایمان پیدا کرتا ہے وہ اسلام کے تمام قوانین کے صحیح اور معتبر ہونے کی اجمالاً تصدیق کرتا ہے اور انھیں ناقابل تردید جانتا ہے اگر چہ ان سب قوانین کے بارے میں اور ان کی مصلحتوں کے بارے میں تفصیلی علم پیدا نہ کر سکے۔اس بناپر بعض قوانین کو قبول کرنے اور بعض کو مسترد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

دین اسلام،خدائے متعال کا دین ہے

سوال: گزشتہ سوال کے پیش نظر،کیا آپ نہیں سوچتے کہ یہ اس چیز کی علامت ہے کہ ہر انسان آزادی رکھتا ہے تاکہ جس دین کو پسند کرے اسے قبول کرے اور ایک مسلمان کو تمام ادیان کا احترام کرنا چاہئے؟

جواب: دین کی حقیقت سے مراد یہ ہے: عبارت ہے کائنات اور انسان کی خلقت کے بارے میں اعتقادات اور عملی فرائض کا ایک سلسلہ،جو انسان کو ان اعتقادات سے تطبیق کرے۔اس بناپر یہ انسان کے اختیار میں ایک تکلفاتی امر نہیں ہے کہ انسان جس دین کو پسند کرے اسے قبول کرے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جس کے تابع انسان اور اس کا اختیار ہے اور اسے اس کی پیروی کرنی چاہئے۔چنانچہ مثلاً یہ مسئلہ ''ہم سورج کی روشنی سے استفادہ کرتے ہیں''ایک حقیقت وواقعیت ہے کہ آزاد انسان ہر گز اس کے مقابلہ میں مختار نہیں ہے کہ ہر روز ایک نظریہ پیش کرے بلکہ اس کے ثبوت کو قبول کرنے اور اپنی زندگی کے مسائل کو اس پر استوار کرنے پر مجبور ہے۔حقیقت میں اگر کوئی دین یہ نظریہ پیش کرے:''ہر انسان یہ آزادی رکھتا ہے کہ مختلف ادیان میں سے کسی ایک کو اپنی پسند کے مطابق قبول کرے''تو اس دین نے اس نظریہ سے اپنے تکلفاتی اور غیر واقعی ہونے کا اعتراف کیا ہے اور اپنے کو باطل ثابت کیا ہے۔

خدائے متعال فرماتا ہے:

''خدا کے پاس دین،اسلام ہے''[۱]۔

مزید فرماتا ہے:

''جو کوئی شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کا انتخاب کرے اسے قبول نہیں کیا جائے گا[۲]''۔

اسلام نے ادیان میں سے تین ادیان کو محترم جانا ہے: نصرانیت،یہودیت اور مجوسیّت اور اس احترام کا معنی یہ ہے کہ (جیسا کہ قرآن مجید کی آیات سے واضح ہوا) ان تین ادیان کے ماننے والے اپنے دین پر باقی رہ سکتے ہیں نہ یہ کہ وہ حق پر ہیں۔

ہلال،اسلام کی علامت نہیں ہے

سوال: ہلال کیوں اسلام کی علامت ہے؟

جواب: اسلام ''ہلال'' کے نام پر کوئی علامت نہیں رکھتا ہے۔لیکن ''چاند اور

ستارہ"، صلیبی جنگوں کے بعد عیسائیوں کے صلیب کے مقابلہ میں، اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کی مشخص علامت کے طور پر رائج ہوا ہے اور اس وقت بھی اکثر اسلامی ممالک کے پرچم پر یہ علامت موجود ہے۔

۱۔(انّ الدین عند اللہ الاسلام...)(آل عمران،۱۹(

۲۔(و من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ...)(آل عمران،۸۵(

چاند، آیات الٰہی سے ایک آیت ہے

سوال: چاند پر سفر کے بارے میں (یہ سفر انسان کے لئے جلدی ہی ممکن ہو گا) آپ کا کیا نظریہ ہے ؟

جواب: اسلام کے مطابق چاند وغیرہ پر سفر کے بارے میں کوئی نظریہ موجود نہیں ہے صرف قرآن مجید نے ان آسمانی کرّات کے بارے میں بیان کیا ہے کہ یہ آیات الٰہی ہیں اور اپنے حیرت انگیز نظم سے توحید کے گواہ اور دلائل ہیں اور انسان کے لئے مسخر کئے گئے ہیں۔

اسلام میں عربی زبان کا مقام

سوال: عربی زبان کو کیوں اسلامی ایمان اور اعتقاد کے جز اور ضرورت کے طور پر قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے: "قرآن اور نماز وغیرہ عربی زبان میں ہونا چاہئے ؟"

جواب: چونکہ قرآن مجید لغت کے لحاظ سے معجزہ ہے (چنانچہ معنی کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے) اس لئے اس کا عربی لغت محفوظ رہنا چاہئے اور نماز کا عربی میں ہونا اسی جہت سے ہے کہ قرآن مجید کے کچھ حصہ کی (سورۂ حمد اور ایک سورہ) ہر رکعت میں قرائت کی جانی چاہئے اور دوسری طرف سے آیات و روایات جو دین کے اصلی مصادر ہیں عربی لغت میں ہیں، مسلمانوں کی عربی زبان کی نسبت عنایت اور توجہ کا سبب یہی ہے۔

دنیا میں یہودیوں کی ذلت و پستی

سوال: بعض مسلمان معتقد تھے کہ یہودی کبھی اپنا ایک آزاد ملک نہیں رکھ سکتے ہیں، البتہ اسرائیل جو اس مختصر مدت میں ایشیا کے ترقی یافتہ ممالک میں سے ایک ملک کی صورت میں ابھرا ہے، اس عقیدہ کے غلط ہونے کی علامت ہے، کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ بہت ساری دوسری احادیث اور روایتیں بھی اسی غلط اعتقاد کے مانند ممکن ہے سیاسی نفوذ کے اثر میں وجود آئی میں ہوں کہ گزشتہ زمانے میں دنیا کے اس علاقہ کے لوگوں کو جہل و نفاق اور دشمنی کی حالت میں رکھنا چاہتے تھے ؟

جواب: جی ہاں ! ایک بندرگاہ اور ایک فوجی چھاونی پر مشتمل فلسطین کا ایک چھوٹا حصہ انگلستان، فرانس اور امریکہ کے لئے ہے۔ اور اسرائیل کے نام پر ایک کٹھ پتلی اور آلہ کار حکومت وہاں پر حکم رانی کر رہی ہے اور اس مختصر مدت کے دوران اس حکومت کی پشت پناہی اور اسے مسلح کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی گئی ہے اور پوری توانائی کے ساتھ اسلامی ممالک کو اس حکومت کے خلاف متحد ہونے نہیں دیا گیا ہے (چنانچہ ان تمام حقائق کو گزشتہ چند سالوں کے واقعات نے واضح کر دیا ہے(

یہ غلط تصور (کہ یہودیوں کی حکومت ایک آزاد اور ترقی یافتہ ہے اور اسلام میں نقل کی گئی روایتوں کے باوجود، کہ یہود کبھی ایک آزاد ملک کے مالک نہیں

بن سکتے،اس حکومت نے نشو ونما پائی ہے) سیاسی نفوذ کا اثر ہے کہ گزشتہ زمانے میں اور آج بھی دنیا کے اس حصہ کے لوگوں کو جہل، نفاق، دشمنی اور دین مقدس اسلام کی نسبت بد ظنی کے عالم میں رکھنا چاہتے ہیں، کیونکہ یہ فکر روایت سے مربوط نہیں ہے تاکہ ہم کہیں کہ یہ جعلی ہے، بلکہ یہ قرآن مجید سے متعلق ہے اور جو کچھ قرآن مجید میں ہے وہ اس صورت میں نہیں ہے کہ بیان ہوا بلکہ اس صورت میں ہے کہ اسے قرآن مجید کی پیشین گوئیوں میں سے ایک شمار کیا جائے۔

خدائے متعال یہودیوں کے مسلمانوں کے خلاف کئے گئے مظالم، جرائم خیانتوں، مہم جوئیوں اور عہد شکنیوں کو گننے کے بعد مسلمانوں کو اتحاد واتفاق ،دینی قوانین کے تحفّظ،اجنبیوں سے دوستی نہ کرنے اور ان کی اطاعت نہ کرنے کی نصیحت کرتا ہے اور فرماتا ہے:

"ان (یہودیوں) پر ذلّت کے نشان لگادئے گئے ہیں یہ جہاں بھی رہیں مگر یہ کہ خدائی عہد یالوگوں کے معاہدہ کی پناہ مل جائے۔یہ غضب الٰہی میں رہیں گے اور ان پر مسکنت کی مار رہے گی۔یہ اس لئے ہے کہ یہ آیات الٰہی کا انکار کرتے تھے اور ناحق،انبیاء کو قتل کرتے تھے۔یہ اس لئے ہے کہ یہ نافرمان تھے اور زیادتیاں کیا کرتے تھے ۱"۔

ایک دوسری آیت میں یہ سبب لوگوں اور خدا سے مربوط بیان ہوا ہے۔

فرماتا ہے:

"ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست اور سرپرست نہ بناؤ کہ یہ خود آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے کوئی انھیں دوست بنائے گا تو انھیں میں شمار ہو جائے گا۔بیشک اللہ ظالم قوم کی ہدایت نہیں کرتا ہے ۲"۔

اور مزید فرماتا ہے:

۱۔(ضربت علیھم الذّلۃ این ماثقفوا الا بحبل من اللہ و حبل من النّاس و باء وابغضب من اللہ وضربت علیھم الذلّۃ والمسکنۃ ذٰلک بانّھم کانوا یکفرون بآیات اللہ ویقتلون الانبیاء بغیر حق ذلک بماعصوا و کانوا یعتدون)(آل عمران،۱۱۲(

۲۔(یاایّھاالذین آمنوا لاتتّخذوا الیھود والنصاری اولیاء بعضھم اولیاء بعض و من یتولّھم منکم فانہ منھم ان اللہ لایھدی القوم الظالمین)(مائدہ،۵۱(

"آج کفار تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں،لہذا تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو..۱"۔

چنانچہ ملاحظہ ہوا کہ خدائے متعال اسلام کی پیش رفت اور یہودیوں کو کچلنے کا ان مسلمانوں کو وعدہ دیتا ہے جو قوانین اسلام اور اتفاق کلمہ کا تحفظ کرتے ہیں ،نہ ان ممالک کو جو اسلام کے نام کے علاوہ کچھ نہیں رکھتے ہیں اور اسی طرح آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اسلام اس حالت میں قرار پایا ہے کہ ایک دن مسلمان اجنبیوں کے ساتھ دوستی کا منصوبہ بنائیں گے اور ان کے آلہ کار بن جائیں گے،اس صورت میں خدا کا معاملہ ان کے ساتھ برعکس ہوگا اور وہ سلطہ وغلبہ کو ہاتھ سے دے دیں گے اور ان کی عزت وسیادت دوسروں کو نصیب ہوگی۔

لیکن یہ کہ احادیث اور روایتوں میں ممکن ہے جعلی اور بناوٹی روایتیں موجود ہوں اس مسئلہ کو علمائے اسلام بخوبی جانتے ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے اس قسم کے بے بنیاد مصادر کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مسلم ہے کہ صدر اسلام میں کچھ منافقین اور یہودی مسلمانوں کے لباس میں آکر جھوٹی روایتیں جعل اور نقل کرتے تھے۔اسی سبب سے علمائے اسلام ہر روایت کو جس صورت میں بھی ہو نقل نہیں کرتے بلکہ ماہرانہ جانچ پڑتال کے بعد موثق روایت کو

تشخیص دے کر قبول کرتے ہیں ان حالات کے پیش نظر (چنانچہ روایتوں میں زیادہ ہے) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:
"میرے بعد مجھ سے بہت سی چیزیں نقل کی جائیں گی، ان میں سے جو قرآن

۱۔(الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشو ھم واخشون...) (مائدہ ۳(
مجید سے مطابقت رکھتی ہوں، انھیں قبول کرنا اور جو قرآن مجید کے مخالف ہوں، انھیں مسترد کریں۱"۔

۱۔ مجمع البیان فی تفسیر القرآن ۱، ۱۳

پانچواں حصہ:

آواگون اور ارواح کا پلٹنا

آواگون اور ارواح کا پلٹنا

حق کیا ہے ؟

سوال: بیس سال قبل، تبریز میں ایک ادبی محفل میں ایک دوست نے جبر و تفویض اور انسان کی تقدیر کی تعیین کی کیفیت پر کرتے ہوئے کہا: "انسان اسّی سے سو بار اس دنیا میں آتا ہے اور چلا جاتا ہے، البتہ اجمادات اور حیوانات کی صورت میں نہیں بلکہ انسان کی صورت میں، تاکہ اس کا مقدّر اس کے سابقہ اعمال نامہ کے مطابق معیّن ہو جائے ورنہ یہ صحیح نہیں تھا انسان کو ایک مرتبہ اس کرّۂ خاکی پر لاتے اور یہ سب رنج و مصیبت برداشت کرتا۔ انسان ایک بار (قضیہ آدم میں) گناہ کا مرتکب ہوا اور زمین پر بھیجا گیا، دنیا سے چلا گیا، پھر پلٹا دیا گیا تاکہ اپنے گزشتہ اعمال کے مطابق اس کے ساتھ سلوک کیا جائے اور اسی طرح یہ حالت جاری رہتی ہے یہاں تک اسّی یا سو مرتبہ اس کی تکرار ہوتی ہے اور یہ انسان ہر بار ایک نوع میں ہوگا: جاہل، عالم، حاکم، محکوم ، مریض، صحت مند، بد صورت، خوبصورت... اور مختلف مراحل اور امتحانات کو طے کرنے کے بعد جس چیز کا مستحق ہے، مکمل طور پر وہ حق حاصل نہیں

کرتا ہے اور اسی بنیاد پر، جس طرح قرآن مجید فرماتا ہے: قیامت کے دن کوئی شخص اپنے اعمال نامہ پر اعتراض نہیں کرے گا۔ اصولاً اگر اس کے علاوہ اور کچھ ہوتا، تو وہ عین ظلم ہوتا کہ ایک پیغمبر ہو اور دوسرا شمر، ایک صالح ہو اور دوسرا قاتل" وغیرہ۔ یہ تھا ہمارے دوست کے موضوع "حق" کے بارے میں بیان کا خلاصہ۔

دوسرا موضوع جو ہمارے دوست نے پیش کیا یہ تھا: آدم، ہمارے اور تمھارے مانند صرف ایک انسان نہیں تھے، بلکہ ایک کلّی مخلوق اور تمام انسانوں پر مشتمل تھے، یعنی تمام افراد، اول سے آخر تک فرد بشری، آدم کے ساتھ تھے، انگور کے گچھّے کے مانند کہ اس میں بہت سے دانے ہوتے ہیں، لیکن چونکہ ہم نے نافرمانی کی، اس لئے ہم سب کو بہشت سے نکال باہر کیا گیا۔ اور اگر آدم صرف ایک فرد تھے، تو دوسروں کا کیا گناہ ہے کہ وہ زمین پر ہوتے ؟اس کے علاوہ، خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے: "ہم نے تمام افراد بشر اور تمام پیغمبروں سے عہد و پیمان لیا ہے" پس، سب لوگ آدم کی خلقت کے وقت خلق ہوئے ہیں۔"

تیسرا موضوع جو دوبارہ پہلے موضوع کی طرف پلٹتا ہے، کے بارے میں وہ دوبارہ کہتا ہے: اگر موت اور زندگی ایک مرتبہ ہو، تو لوگوں کی اکثریت بہشت کی حق دار نہیں ہوگی اور اغلب لوگ درمیان میں قرار پائیں گے اور عملی طور پر نہ اہل بہشت ہوں گے اور نہ اہل جہنّم، جبکہ قرآن مجید لوگوں کو صرف دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے: بہشتی اور جہنّمی۔ لیکن اگر انسان اسّی یا سو مرتبہ دنیا میں آئے اور اعمال کا مرتکب ہو جائے، تو اعمال انجام دینے کے لئے مساوی شرائط اور کافی وقت رکھنے کے سبب یک طرفہ ہوں گے اور اس وقت بہشت اور جہنّم کا یہ حق عادلانہ ہوگا۔" استدعا ہے کہ اس موضوع کے بارے میں تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔

جواب: سلام علیکم۔ آپ کا خط ملا۔ تفصیلی جواب چاہتے ہیں، لیکن افسوس! اس کے علاوہ کہ بالکل فرصت نہیں تھی، میں بیمار بھی تھا جو فطری طور پر کام میں رکاوٹ کا سبب بنتا ہے، لہذا مطلب کے سلسلہ میں مختصر جواب ارسال کیا جاتا ہے۔ اگر اتفاق سے پھر بھی کوئی اشکال پیدا ہوا، تو لکھئے تاکہ انشاءاللہ تدریجی طور پر تمام اشکالات حل ہو جائیں گے۔

روح کا بدن سے جدا ہونے کے بعد دوبارہ دنیا میں پلٹنے کا مسئلہ، "تناسخ" کے نام سے معروف ہے اور اس کے اصلی معتقد بت پرست ہیں۔ وہ کہتے ہیں :انسان اگر دنیوی زندگی میں دنیوی تعلقات سے پاک ہو جائے تو خدا کے اندر فانی ہو جاتا ہے اور خداؤں کی صف میں قرار پاتا ہے اور اس کے علاوہ اگر کوئی شخص صالح ہو، تو اس کی روح بدن سے جدا ہونے کے بعد، دوسرے بدن سے متعلق ہوتی ہے جو کامیاب اور نعمتوں سے بھری زندگی کا مالک ہوتا ہے اور اس کے صالح اعمال کا ثواب وہی نعمتوں کے اقسام ہیں کہ دوسرے بدن میں پائے جاتے ہیں اسی طرح دوسرے بدن سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے.... اور ہر بدن میں روح کی زندگی کے حالات، اس کے گزشتہ بدن میں انجام پائے گئے اعمال کی پاداش ہے"۔

اگر کوئی شخص سرکش اور گناہ کار ہو تو، اس کی روح بدن سے جدا ہونے کے بعد دوسرے بدن سے متعلق ہوتی ہے اور اپنے برے اعمال کی سزا کو دوسرے بدن میں پاتی ہے اور اسی طرح دوسرے بدن سے جدا ہونے کے بعد تیسرے اور پھر چوتھے... اور یہ حالت (ہر بدن کے بعد دوسرے بدن سے روح کا تعلق اور گزشتہ بدن کی اعمال کا جزا اگلے بدن میں چکھنے کی حالت) روح کے لئے لامتناہی صورت میں جاری رہتی ہے... اس لحاظ سے وہ روز قیامت اور اخروی جزا و سزا کے منکر ہیں اور اس قول کی بنیاد پر منکر ہونا چاہئے، کیونکہ تناسخ کی بنیاد پر روح کا ذاتی اقتضا یہ ہے کہ ہر بدن کے اعمال کے جزا اسے دوسرے بدن میں ملے، اس لئے قیامت کے دن جزا کے لئے کوئی زمینہ ہی باقی نہیں رہتا ہے۔ اس قول کا دوسرا لازمہ یہ ہے کہ وہ انسان کی دنیا کو "دائمی

''جانتے ہیں اوراس عالم موجود کے لئے لا متناہی عمر کے قائل ہیں۔اس کے علاوہ یہ کہ ان کے نظریہ کے مطابق انسان کی روح کبھی تنزّل کر کے حیوانی بدن میں اوراس کے بعد نباتی بدن میں اور پھر جمادی بدن سے تعلق پیدا کرتی ہے۔لیکن آپ کا یہ دوست تناسخی بدنوں کواسّی سے سوبدن تک محدود کرتا ہے اور قیامت وحشر کا بھی قائل ہے اور روح کادوسرے بدن سے تعلق پیدا کرنے کو''حق'' جانتاہے،نہ گزشتہ اعمال کی پاداش وجزا۔اس کے باوجود انسان کی نوع کے لئے ابتدائے تاریخ،یعنی مشخص باپ کا قائل نہیں ہے اور قرآن کا بھی معتقد ہے۔اپنے قول کی جواس نے توجیہ کی ہے وہ یہ ہے کہ ہر انسان کومرنے کے بعد اسّی سے سو مرتبہ دوبارہ دنیا میں آکر زندگی کرنی چاہئے تاکہ ہر مرتبہ نئی زندگی کے حالات نئے شرائط کے ساتھ اس کے لئے پیدا ہوجائیں اوران کے مطابق اطاعت یامعصیت کرے،جب اس کے لئے تمام شرائط پیش آئیں گے تو ثواب وعقاب کے لحاظ سے اس کی تقدیرات معیّن ہوتی ہیں تاکہ قیامت کے دن''حق'' کے مطابق اپنے عمل کی جزا پائے ورنہ صرف جبر وتفویض سے ہاتھ نہیں آتاہے اور بشر کی اخروی تقدیرات معیّن نہیں ہوتی ہیں، کیونکہ :

سب سے پہلے: لازم ہوتا ہے کہ خدائے متعال ظالم ہو کہ ایک کو(پیغمبر) اور دوسرے کو''شمر'' خلق کیاہے،ایک کو''خوشبخت'' اور دوسرے کو ''بدبخت''.. خلق کیاہے اور خدا ظلم سے منزّہ وپاک ہے۔

دوسرے یہ کہ :افراد بشر کی نوع دنیا میں اپنی زندگی سے شاکی اور ناراض ہیں، لیکن قیامت کے دن جب ہر ایک کا نامہ اعمال اس کے ہاتھ میں دیں گے،تو کسی کے منہ سے شکایت کی آواز نہیں نکلے گی، یہ خدا کے خوف سے نہیں ہے، کیونکہ اگر خدائے متعال قہر سے انسان کو خاموش کردے اور بات کرنے کی اجازت نہ دے تو یہ ظلم ہوگا،بلکہ یہ اس جہت سے ہے کہ جب انسان اپنے نامہ اعمال کو دیکھتا ہے تو اپنے اعمال کا مشاہدہ کرتا ہے کہ جب ہر دفعہ ہر شرائط میں آیاہے،دوبارہ نافرمانی کی ہے،اس لئے خاموش رہتاہے اور قرآن مجید بھی اس موضوع کا گواہ ہے کہ کسی سے کوئی آواز نہیں نکلتی ہے۔

تیسرے یہ کہ : قیامت کے دن انسان دو حصوں میں تقسیم ہوں گے،اہل بہشت اور اہل جہنّم کا اگر دنیا میں ایک مرتبہ آنا ہوتا تو اکثر لوگ بہشت وجہنّم کے حق کو نہیں پاسکیں گے، کیونکہ ایک مرتبہ آنے میں تمام لوگوں کے لئے شرائط مساوی نہیں ہیں فقیر چور کہہ سکتاہے،اگر میں دولتمند ہوتا تو چوری نہیں کرتا اور زناکار مرد کہے گا: اگر میری بیوی ہوتی تو میں زنا نہیں کرتا، صرف سو سے اسّی مرتبہ رفت وآمد کرنا اور تمام شرائط کو دیکھنا ہے جس سے ''حق''تمام ہوتاہے،اس کے باوجود لوگوں کا دو گروہ سے زیادہ ہونا قرآن مجید کے روسے دو گروہ ہونے کے واضح خلاف ہے۔

یہ تھا اس شخص کے قول کا خلاصہ جسے آپ نے نقل فرمایاہے، لیکن یہ ہر جہت سے باطل قول ہے:

سب سے پہلے :اسّی سے سو مرتبہ تک دنیا میں آنے کی عدد ایک ایسا قول ہے جس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔اس کے علاوہ قرآن مجید میں۔دنیا کی زندگی،اور انسان کے عمل اوراس کی جزا کے بارے میں بے شمار آیتیں موجود ہیں۔تناسخ اوراس کے اسّی مرتبہ ہونے کی خبر نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید دنیا کی زندگی کو ایک بار شمار کرتاہے، چنانچہ فرماتاہے:

...)وکنتم امواتاً(جماد)فاحیاکم(دنیامیں)ثمّ یمیتکم(دنیاسے)ثمّ یحییکم(برزخ میں)ثمّ الیہ ترجعون(قیامت))(بقرہ،۲۸(

...''جب کہ تم بے جان تھے(جماد) اور خدانے تمھیں زندگی دی ہے(دنیامیں) اور پھر موت بھی دے گا(دنیاسے)اور پھر زندہ بھی کرے گا(برزخ میں) اور پھراس کی بارگاہ میں پلٹا کرلے جائے جاؤگے(قیامت''(

دوسری آیت میں :

) قالوا ربّنا امّتنا اثنتین واحییتنا اثنتین فاعترفنا بذنوبنا فھل الی خروج من سبیل)(مومن، ۱۱(

اہل جہنّم کی زبان سے نقل ہوا ہے کہ ایک مرتبہ دنیا کے لئے مارنے اور دوسری مرتبہ برزخ کے لئے ثابت کرتا ہے۔

اس کے علاوہ، آپ کے دوست کے بیان کے برعکس، اگر مسئلہ جبر واختیار حل نہ ہو جائے، تو اسّی سے سو مرتبہ دنیا میں آنے سے، انسان کی تقدیر معیّن نہیں ہوتی اور فرض کریں انسان سو مرتبہ دنیا میں لوٹ کر آیا ہے اور تمام شرائط قتل نفس جیسے گناہ کا مرتکب ہوا ہے تو، اگر ہم جبر کے قائل ہوں تو کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا ہے، سو مرتبہ لوٹنا جرم کے ثبوت میں کوئی اثر نہیں رکھتا، پھر بھی اس شخص کا کیفر اور عذاب ظلم ہے، لیکن اگر ہم اختیار کے قائل ہوں گے، تو اپنے استدلالی ذوق سے سمجھتے ہیں کہ جو عقل و بالغ اگر اپنے اختیار سے کوئی ناشائستہ کام انجام دے تو مجرم اور مسؤل رہے اور اس کے لئے ایک مرتبہ معصیت کا تحقق ہونا جرم کے ثبوت کے لئے کافی ہے اور مختلف شرائط میں سو یا اسّی مرتبہ اس کا تحقق ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح معصیت کا تحقق بھی پہلی زندگی میں کافی ہے اور اس کے ساتھ بعد والی زندگیوں کا ضمیمہ ہونا ضروری نہیں ہے۔

اور یہ جو کہا ہے: خدا نے ایک کو "پیغمبر" اور دوسرے کو "شمر" خلق کیا ہے، شمر کو عذاب کرنا ظلم ہے۔ ایک اشتباہ ہے۔ خدا نے شمر کو ایک عام انسان خلق کیا ہے لیکن وہ اپنے اختیار سے خود "شمر ظالم" بنا ہے۔ اس کی خلقت میں ظلم نہیں ہے، لیکن اس کا ظالم بننا خود اس سے مربوط ہے نہ خدا سے۔

اور یہ کہنا: اگر زندگی ایک مرتبہ ہوتی، تو انسان، اس کے پیش نظر زندگی سے ناراض ہوتا اور قیامت کے دن اعتراض کرے گا۔ بھی ایک اشتباہ ہے، کیونکہ زندگی سے ناراض ہونا، خود ایک اور جرم ہے، البتہ کوئی انسان نہیں چاہتا ہے کہ قیامت کے دن اس کے جرائم سے پردہ اٹھایا جائے، جو کچھ خدا نے انسان کو اپنی نعمت سے دیا ہے، وہ فضل ورحمت ہے اور جو کچھ نہیں دیا ہے، صاحب اختیار ہے، ہم خالق کائنات سے نہ متقاضی ہیں نہ قانونی سند حاصل کی ہے کہ جو ہمارا دل چاہے، ہمیں دے دیا جائے۔

اور جو یہ کہا ہے: اگر زندگی ایک مرتبہ ہوتی، تو لوگ قیامت کے دن دو قسم سے بیشتر ہوتے، کیونکہ اکثر لوگوں کے خیر وشر کے اعمال مساوی ہیں اور اس وقت نہ اہل بہشت ہوتے اور نہ اہل جہنّم اور یہ واضح طور پر قرآن مجید کے خلاف ہے۔ یہ ایک اور غلطی ہے گویا اس کی مراد یہ ہے کہ چونکہ اکثر لوگ مساوی شرائط میں قرار نہیں پاتے ہیں، اس لئے جرم انجام دینے والے کو مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا ہے اور اسی طرح اطاعت کرنے والے کو نیک انسان محسوب نہیں کیا جاسکتا ہے، نتیجہ کے طور پر اکثر لوگ نیک ہیں نہ بدکار اور یہ نہیں کہا جاسکتا ہے وہ بہشتی ہیں یا جہنّمی، ناگزیر وہ تیسری قسم ہیں، جبکہ تیسری قسم کا وجود ہی نہیں ہے۔

اس امر کا اعتقاد رکھنے والے نے اس نکتہ سے غفلت کی ہے کہ عقل کے واضح حکم سے، یہ شرائط کہ فعل، اطاعت یا معصیت محسوب ہوتا ہے اور اچھے اور برے کی پاداش ہونی چاہئے۔ بلوغ، عقل، عمد اور اختیار ہے، جوں ہی فعل معصیت، مثلاً ان شرائط کے ساتھ انجام پائے تو پہلی بار جرم کی پاداش شمار کی جاتی ہے، اس میں زندگی کی دوسری شرطیں ہرگز مداخلت نہیں کرتی ہیں، یہ عقل کا حکم ہے اور عقلمند انسان بھی اپنی زندگی کے محیط میں اس کی تبعیت کرتے ہیں۔ اسلام کی مقدس شریعت میں، ہی شرائط معتبر ہیں اور قرآن مجید میں بھی ہر اطاعت اور معصیت کے تحقق کو میزان قرار دیا گیا ہے اور مختلف شرائط میں سو مرتبہ یا اسّی مرتبہ کی قید نہیں ہوئی ہے معصیت سے توبہ کی آیات بھی پہلی مرتبہ معصیت انجام پانے سے مربوط ہیں اور اسی طرح احکام کی آیات بدون اس کے کہ تمام شرائط سے مفید ہوں اور ان سب سے واضح تر حدود سے متعلق آیات ہیں۔ اسلام میں کچھ معصیتیں جو قتل وقصاص اور تازیانہ جیسے حدود رکھتے ہیں، اگر پہلی بار جرم نہ ہوتے، تو حدود کا اجرا معنی نہیں رکھتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ فعل پہلی بار جرم ہو اور اس کے لئے خدا کی

حجت قائم ہو جائے لیکن آخرت میں جرم ثابت نہ ہو کر حجت گر جائے؟

ان تمہیدات سے واضح ہوتا ہے کہ لوگوں کی اکثریت کو پہلی زندگی میں تیسری قسم کے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔نہ بہشتی اور نہ جہنمی۔اور اگر فرض کریں کچھ لوگ ایسے پیدا ہو جائیں جن کے گناہ وثواب مساوی ہوں اور ان کا بہشتی یا جہنمی ہونا ثابت نہ ہو جائے، پھر بھی وہ مومن ہیں اور ان کا اعتقاد پسندیدہ ہے، ورنہ اہل جہنم ہوتے، قطعاً (قرآن مجید کی بہت سی آیات کے مطابق جو کفار کو ہمیشہ کے لئے آگ میں رہنے کا تعارف کراتی ہیں) یہ لوگ آیہ کریمہ: (...ولایشفعون الالمن ارتضی...)۱ کے مطابق شفاعت کرنے والوں سے شفاعت پائیں گے۔

لیکن قرآن مجید کی تقسیم بندی: قرآن کریم انسانوں کو عاقبت امر کے نقطہ نظر سے، دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، اہل سعادت و بہشت اور اہل شقاوت وجہنّم (فاماالذین شقوا... واماالذین سعدوا)۲۔

حساب اور روز قیامت کے تمام حالات کے پیش نظر انسانوں کی تین قسم بیان فرمائی ہے: اہل عمل صالح و پسندیدہ اعتقادات والے، ان کے برعکس اور ''مستضعفین'' کی جماعت جن پر دنیا میں حجّت تمام نہیں ہوئی ہے، یہ اہل حساب وسوال ہیں ان کا کام خدا کے ہاتھ میں ہے تاکہ ان کے حق میں کیا حکم فرمائے:

)وآخرون مرجون لأمر اللّٰہ امایعذّبھم وامایتوب علیھم...)(توبہ،۱۰۶(

''اور کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں حکم خدا کی امید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ یا خدا ان پر عذاب کرے گا یا ان کی توبہ قبول کرلے گا''...

دوسری نظر میں اہل سعادت کو اصحاب میمنہ اور سابقین میں تقسیم فرمایا ہے اور اقسام کو تین قسموں میں معرفی فرمایا ہے:

)وکنتم ازواجاثلٰثۃ* فاصحب المیمنۃ مااصحب المیمنۃ* والسّابقون السّابقون* اولئک المقرّبون)(واقعہ،۷۔۱۱(

۱۔انبیاء،۲۸

۲۔ھود،۱۰۶۔۱۰۸

''اور تم تین گروہ ہو جاؤ گے۔ پھر داہنے ہاتھ والے اور کیا کہنا داہنے ہاتھ والوں کا۔اور بائیں ہاتھ والے اور کیا پوچھنا ہے بائیں ہاتھ والوں کا۔اور سبقت کرنے والے تو سبقت کرنے والے ہی ہیں۔وہی اللہ کی بارگاہ کے مقرب ہیں۔''

اور جو یہ کہا ہے: '' آدم علیہ السلام سے قرآن مجید کا مقصود کلّی آدم ہے نہ ایک نفر اور جزئی، کیونکہ سب سے پہلے: خدا آدم سے فرماتا ہے: بہشت سے تم سب نیچے چلے جانا جب کہ تم میں سے کچھ لوگ دوسروں کے دشمن ہیں'' معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسان آدم کی خلقت کے ساتھ ہی پیدا ہوئے ہیں ،بہشت میں تھے، ہر ایک نے گناہ کیا حتی پیغمبروں نے بھی، اگر آدم ایک بشر ہوتے اور انھوں نے گناہ کیا ہوتا تو دوسروں کو بہشت سے نکال باہر کرنا ظلم ہوتا اور خدا ظلم سے منزّہ و پاک ہے۔

دوسرے یہ کہ: خدا فرماتا ہے: ہم نے تمام انسانوں سے عہد وپیمان لیا ہے، پس سب آدم علیہ السلام کے ساتھ خلق ہوئے تھے، گناہ کر چکے تھے کہ بعد میں ان سب سے پیمان لیا گیا ہے۔

تیسرے یہ کہ: اگر سب پیغمبروں نے آدم کی خلقت کے ساتھ خلق ہو کر گناہ نہ کیا ہوتا تو انھیں اس دنیا میں بھیج کر اس رنج وغم میں گرفتار کرنا بھی ظلم تھا

۔

یہ بیان ایک اور مغالطہ ہے، کیونکہ سب سے پہلے: ہم نے آدم کے قصہ کو تورات، انجیل یا قدیم افسانوں سے نہیں لیا ہے، یہ امر قرآن مجید سے لیا گیا ہے اور قرآن مجید انتہائی واضح صورت میں آدم کو ایک بشری فرد۔ کہ بعد کے انسانوں کے باپ ہیں۔ بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے:

)یا ایّھا النّاس اتّقوا ربّکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منھا زوجھا وبثّ منھما رجالا کثیرا ونساء...)(نساء، ا(

''انسانو! اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اس کا جوڑا بھی اس کی جنس سے پیدا کیا اور پھر دونوں سے بکثرت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دئے ہیں''...

قرآن مجید ''عربی مبین'' ۔یعنی آشکار۔ عربی میں ہے، لہذا عربی جاننے والوں سے پوچھنا چاہئے کہ ''رجالا کثیرا ونساء'' کے مقابلہ میں ''نفس واحدۃ'' کا معنی، ایک فرد بشر ہے کہ سب انسانوں کا باپ اور اس کی بیوی تمام انسانوں کی ماں ہے، یا ایک کلّی معنی ہے۔ یہ وہ کلمات ہیں جنھیں قرآن مجید نے بیان فرمایا ہے اور آدم کی خلقت سے مربوط دوسری آیتوں کا بھی یہی حال ہے۔

دوسرے یہ کہ: یہ جو کہتا ہے کہ ''تمام انسان آدم کے ساتھ تھے اور ہر ایک نے گناہ کیا ہے'' اصل قصہ (زمین پر خلیفہ ہونے) میں آدم کے ساتھ شریک ہونا صحیح ہے لیکن اس ترتیب سے نہیں کہ سب آدم کے ساتھ الگ سے خلق ہوئے ہوں، بلکہ حضرت آدم، بشر کا نمونہ اور نمائندہ تھے کہ تمام بشر فطری طور پر آدم کے حکم میں تھے۔

لیکن یہ دوست، جس گناہ کو مکرّر آدم اور تمام پیغمبروں بلکہ تمام بشر سے نسبت دیتا ہے، ایک اشتباہ ہے، کیونکہ:

سب سے پہلے نص قرآن کے مطابق:

)قلنا اھبطوا منھا جمیعا فامّا یاتینّکم منّي ھدی...)(بقرہ، ۳۸(

''اور ہم نے یہ بھی کہا کہ یہاں سے اتر پڑو پھر اگر ہماری طرف سے ہدایت آجائے''...

تشریع دین سقوط آدم کے بعد ہوا ہے اور دین سے قبل معصیت کا معنی نہیں ہے پس جب تک آدم اور اس کی اولاد گناہ کریں معصیت اور گناہ کا وجود نہیں تھا بلکہ درخت سے نہ کھانے کی نہی ایک خیر خواہی اور راہنمائی تھی کہ اگر اس پر کان دھرتے تو نتیجہ حاصل کرتے، یہ نہی ہرگز حکم دین والی نہیں تھی کہ جس کی مخالفت کرنے میں عذاب ضروری ہے۔

دوسرے یہ کہ: کہا ہے: ''تمام انسانوں سے پیمان لیا گیا ہے، پس سب آدم کے ساتھ موجود تھے اور گناہ میں شریک تھے کہ اس کے بعد ان سے پیمان لیا گیا ہے'' یہ ایک اور اشتباہ ہے اور ہرگز پیمان لینے میں گزشتہ خلاف ورزی اور گناہ کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

تیسرے: یہ کہ اس نے کہا ہے: ''اگر پیغمبروں نے گناہ نہیں کیا ہوتا تو ان کو اس دنیا میں بھیجنا اور زندگی کے رنج و زحمت میں مبتلا کرنا ظلم تھا''۔ ایک اور مغالطہ ہے، کیونکہ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت کے مطابق:

)واذ قال ربّک للملائکۃ انّی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ...)(بقرہ، ۳۰(

''اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں''

آدم کو زمین میں زندگی کرنے اور نسل کو جاری رکھنے کے لئے خلق کیا گیا تھا اور ملائکہ نے اس معنی کو سمجھ کر عرض کی:

...)اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدّماء...) (بقرہ ۳۰(

..."اورانہوں نے کہا کہ کیااسے بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے اور خونریزی کرے"

حتی شیطان نے بھی سمجھ لیااور سجدہ سے نافرمانی کرتے ہوئے کہا:

)أرایتک ھذاالذی کرّمت علي لئن اخّرتن الی یوم القیٰمۃ

لاحتنکنّ ذریتہ الاقلیلا)(اسراء، ۶۲(

"کیاتونے دیکھا کہ یہ کیاشے ہے جسے میرے اوپر فضیلت دے دی ہے اب اگرتونے مجھے قیامت تک کی مہلت دے دی تو میں ان کی ذریت میں چندافراد کے علاوہ سب کا گلا گھونٹتارہوں گا"

اور حتی آدم اوران کی زوجہ کونکال باہر کرانے کے لئے ان کی شرم گاہیں دکھاتاتھاچنانچہ اس سلسلہ میں قرآن مجید فرماتاہے:

)فوسوس لھماالشیطٰن لیُبدي لھماماوٗری عنھمامن سُوءٰاتھما...)(اعراف، ۲۰(

"پھرشیطان نےان دونوں میں وسوسہ پیداکرایاکہ جن شرم کے مقامات کوچھپارکھاہے وہ نمایاں ہوجائیں"...

پس بہشت میں داخل ہوناز مین پر تنزّل،دین کی تشریع اوردینی تربیت کے طریقہ کامقدمہ تھا۔انسان اس دنیوی زندگی میں دین کے سایہ میں مقام قرب پاتاہےاور کمال میں عروج پیداکرتاہے۔دینی تربیت کے بغیراس کے لئے بہشتی حالت پیداہوناممکن نہیں ہے۔دنیوی زندگی اگرچہ رنج ومحنت سے بھری ہوتی ہے،چنانچہ خدائے متعال نے آدم سے فرمایا:

...)فلا یخرجنکمامن الجنۃ فتشقی...)(طہٰ،۱۱۷(

..."کہیں تمھیں جنت سے نکال نہ دے کہ تم زحمت میں پڑجاؤ"

اورفرمایا:

)لقدخلقناالانسٰن في کبد)(بلد،۴(

"ہم نے انسان کومشقّت میں رہنے والا بنایاہے"

لیکن آخرت کی ابدی زندگی اورانسان کے سرمایہ کامقدمہ بالآخرایک امتحان زندگی ہے،چنانچہ فرماتاہے:

)کلّ نفس ذائقۃالموت ونبلوکم بالشر والخیرفتنۃ...)(انبیاء، ۳۵(

"ہرنفس موت کامزہ چکھنے والاہےاور ہم تواچھائی اوربرائی کے ذریعہ تم سب کوآزمائیں گے"...

اورانسان اس امتحانی زندگی کے دورہ میں،دین کے سایہ میں قرب وکمال کے ایک ایسے مقام تک پہنچ سکتاہے کہ ہرگزاس وسیلہ کے بغیریہ مقام حاصل نہیں کرسکتاہے۔

چھٹا حصہ:

علم امام علیہ السلام

علم امام علیہ السلام

امام حسین علیہ السلام کا اپنی شہادت کے بارے میں آگاہ ہونا

سوال: کیا حضرت سید الشہداء علیہ السلام مکہ سے کوفہ کی طرف اپنے سفر میں آگاہ تھے کہ وہ شہید ہو جائیں گے ؟ دوسرے الفاظ میں، کیا حضرت امام حسین علیہ السلام شہادت کی غرض سے عراق کی طرف روانہ ہوئے تھے یا سو فیصدی ایک عادلانہ اسلامی حکومت تشکیل دینے کی غرض سے ؟

جواب: شیعہ امامیہ کے عقیدے کے مطابق حضرت سید الشہداء، واجب الاطاعت امام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تیسرے جانشین ،ولایت کلیہّ کے مالک تھے۔ دلائل نقلیہ اور عقلی استدلال کے مطابق خارجی حقایق، حوادث اور واقعات کے بارے میں علم امام کے مندرجہ ذیل دو قسم اور دو راہیں ہیں:

امام علیہ السلام عالم ہستی کے حقائق کے بارے میں ہر قسم کے شرائط میں اذن الٰہی سے آگاہ ہیں، خواہ یہ حقائق اور حوادث حسی ہوں یا غیر حسی، جیسے: آسمانی مخلوقات، گزرے ہوئے حوادث اور مستقبل کے واقعات، اس مطلب کی دلیل روایات کے مطابق متواتر ہے کہ شیعوں کی حدیث کی کتابوں جیسے کافی ،بصائر، صدوقؒ کی کتابوں اور کتاب بحار وغیرہ میں درج ہیں۔ ان روایات کے مطابق، جن کی کوئی حد نہیں، امام علیہ السلام خدا کی عنایت سے سب چیزوں کے بارے میں آگاہ ہیں نہ اکتساب سے۔ اور جس چیز کو چاہیں اسے خدا کے اذن سے تھوڑی سی توجہ کے نتیجہ میں جانتے ہیں۔

البتہ قرآن مجید میں چند آیتیں ہیں، جو علم غیب کو خدائے متعال سے مخصوص اور اس کی مقدس ذات میں منحصر قرار دیتی ہیں، لیکن جو استثناء آیہ کریمہ:

)عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احداً* الاّ مَن ارتضی من رسول...)(جن،۲۶۔۲۷(

"وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا، مگر جس رسول کو پسند کرلے۔"

میں موجود ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم غیب کا خدائے متعال سے مخصوص ہونا اس معنی میں ہے کہ غیب کو آزادی کے ساتھ بذات خود، خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے۔ لیکن ممکن ہے پسندیدہ پیغمبر خدائے متعال کی تعلیم سے اسے جان لیں اور ممکن ہے دوسرے پسندیدہ اشخاص بھی پیغمبروں کی تعلیم سے اسے جان لیں۔ چنانچہ بہت ساری ان روایتوں میں نقل ہوا ہے کہ پیغمبرؐ نیز ہر امامؑ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں علم امامت کو اپنے بعد والے امام کے حوالہ کرتے تھے۔

اور عقلی بعض استدلال موجود ہیں جن کے مطابق امام علیہ السلام اپنے نورانی مقام کے توسط سے اپنے زمانہ کے کامل ترین انسان اور خدا کے اسماء و صفات کے مکمل مظہر اور دنیا کی تمام چیزوں اور ہر شخصی واقعہ کے بارے میں واقف ہیں اور اپنے وجود عنصری کے مطابق ہر جہت میں توجّہ کریں، تو ان کے لئے حقائق روشن ہوتے ہیں۔ (ہم ان استدلالوں کی تفسیر کو اپنی خاص جگہ پر چھوڑتے ہیں، کیونکہ یہ پیچیدہ استدلالی مسائل کا ایک سلسلہ ہے اور ان کی سطح اس

مقالہ سے بلند تر ہے(

جس نقطہ کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ اس قسم کا علم عطیہ الٰہی ہے اور عقلی و نقلی دلائل کے موجب، جو اسے ثابت کرتے ہیں، ہر قسم کی خلاف ورزی سے منزّہ اور ناقابل تغیر ہے اور اس میں ایک ذرّہ بھی خطا نہیں ہوتی اور اصطلاح میں جو کچھ لوح محفوظ میں لکھا ہے اس کا علم ہے، اور جو کچھ خدائے متعال کی حتمی قضا ہے اس کی آگاہی ہے۔

اور اس مطلب کا لازمہ یہ ہے کہ اس قسم کے علم سے کسی طرح کی تکلیف اور فریضہ تعلق نہیں رکھتا (اس جہت سے کہ اس قسم کے علم سے متعلّق ہے اور قطعی واقع ہونے والا ہے) اور اسی طرح انسان کا قصد اور تقاضا اس کے ساتھ رابطہ پیدا نہیں کرتا کیونکہ تکلیف ہمیشہ امکان کی راہ سے فعل سے متعلق ہے اور اس جہت سے کہ فعل اور اس کا ترک دونوں مکلف کے اختیار میں ہیں، فعل یا ترک مطلوب ہوتا ہے، لیکن ضروری الوقوع اور حتمی قضاء کی جہت سے اس کا حتمی ہونا مورد تکلیف قرار پانا کمال ہے، مثلاً یہ صحیح ہے کہ خدا اپنے بندہ سے فرمائے فلاں کام، جس کا انجام دینا یا ترک کرنا تیرے لئے ممکن ہے اور تیرے اختیار میں ہے، اسے انجام دیدو لیکن محال ہے کہ خدا یہ فرمائے کہ فلاں کام جو میری مشیت تکوینی اور حتمی قضا ہے، بیشک تحقق پائے گا اور اس میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں ہوگا، اسے انجام دو یا نہ دو، کیونکہ اس قسم کا امر و نہی، لغو اور بے معنی ہے۔

اسی طرح انسان ایک ایسے امر کے بارے میں ارادہ کرکے اپنے لئے مقصد اور ہدف قرار دے سکتا ہے اور اس کے تحقق کے لئے جستجو کر سکتا ہے جس میں ہونے یا نہ ہونے کا امکان موجود ہو، لیکن ہرگز ایک ایسے امر کے بارے میں ارادہ کرکے اسے اپنا مقصد قرار نہیں دے سکتا ہے، جو یقینی (ناقابل تغیر و خلاف ورزی) اور حتمی قضا کے طور پر ہونے والا ہو، کیونکہ جو امر بہر حال ہونے والا ہو اس میں انسان کا ارادہ و عدم ارادہ اور قصد و عدم قصد کسی قسم کا اثر نہیں رکھتا ہے کیونکہ یہ ہونے والا ہوتا ہے (توجہ کی جائے(!

اس بیان سے واضح ہوتا ہے:

۱۔امام علیہ السلام کو عطیہ کے طور پر عطا کیا گیا یہ علم ان کے اعمال میں کوئی اثر نہیں رکھتا ہے اور ان کی خاص تکلیف سے اس کا کوئی ربط نہیں ہوتا ہے ۔اور اصولی طور پر ہر فرض کیا گیا امر جو قضائے حتمی اور حتمی الوقوع سے متعلق ہو، وہ انسان کے امر و نہی یا قصد و ارادہ سے متعلق نہیں ہوتا ہے۔

جی ہاں! قضائے حتمی اور خدائے متعال کی قطعی مشیت سے متعلق امور رضا بہ قضا سے مربوط ہیں، چنانچہ سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی زندگی کے آخری لمحات میں، خاک و خون میں لت پت ہو کر فرماتے تھے:

"رضا بقضائک وتسلیماً لأمرک لا معبود سواک" ۱۔

اسی طرح مکہ سے خارج ہوتے ہوئے اپنے خطبہ میں فرمایا:

"رضا اللہ رضانا اھل البیت" ۲۔

ہم اہل بیت کی رضایت اللہ تعالی کی رضایت ہے

۲۔انسان کے فعل کا قضائے الٰہی سے متعلق ہونے کے لحاظ سے حتمی ہونا اس کے اختیاری فعالیت کی نظر میں اس کے صاحب اختیار ہونے سے منافی نہیں ہے، کیونکہ

۱۔ معالی السبطین: ۲،۲۱ (مختصر فرق کے ساتھ(

۲۔(لہوف،۲۶(

قضائے الٰہی فعل کی تمام کیفیتوں کے باوجود اس سے تعلق پیدا کر چکی ہے نہ مطلق فعل سے، مثلاً خدائے متعال نے چاہا ہے کہ انسان فلاں اختیاری فعل کو اپنے اختیار سے انجام دے اور اس صورت میں اس فعل اختیاری کا خارج میں واقع ہونا، اس جہت سے کہ خدا کی مرضی سے متعلق ہے، حتمی اور ناقابل اجتناب ہے اور اسی حالت میں اختیاری بھی ہے اور انسان سے نسبت امکانی صفت رکھتا ہے۔(قابل توجہ(!

۳۔یہ کہ امام علیہ السلام کے ظاہری علل واسباب سے قابل تطبیق ظاہری اعمال کو اس عطا شدہ علم کے فقدان کی دلیل اور واقعات کے بارے میں جہل کا گواہ قرار نہیں دینا چاہئے، جیسے کہ کہا جائے: اگر سید الشہداء علیہ السلام حادثہ کے بارے میں آگاہ تھے تو آپؑ نے کیوں حضرت مسلم کو کوفہ بھیجا؟ صیداوی کے توسط سے اہل کوفہ کو کیوں خط لکھا؟ کیوں خود مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے؟ آپؑ نے کیوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا؟ جبکہ خدا فرماتا ہے
:

...)ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ...)(بقرہ،۱۹۵(

...''اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالو''...

کیوں؟ کیوں؟..

ان تمام سوالات کا جواب ہمارے بیان کئے گئے مذکورہ نکتہ کے پیش نظر واضح ہے اور اس کی تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن مجید کی نص کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسی طرح (آپ کی پاک عترت سے)امام علیہ السلام دیگر افراد بشر کے مانند بشر ہیں اور اپنی زندگی کی راہ میں جو اعمال انجام دیتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کی طرح اختیاری اور عادی علم کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔امام علیہ السلام بھی دوسروں کی طرح کام کے خیر وشر سے اور نفع ونقصان کو عادی علم سے تشخیص دے کر، جس کام کو انجام دینے کے لائق اور شائستہ جانتے ہیں، اس کا ارادہ کر کے اس پر عمل کرنے کی جستجو کرتے ہیں جہاں پر علل وعوامل اور خارجی حالات موافق ہوں مقصد تک پہنچتے ہیں اور جہاں پر اسباب اور شرائط موافق نہ ہوں آگے نہیں بڑھتے۔(یہ کہ امام علیہ السلام خدا کے اذن سے تمام حوادث کے جزئیات، گزشتہ اور آئندہ، کے بارے میں واقف ہیں ان کے اختیاری اعمال پر کسی قسم کا اثر نہیں ڈالتے، جیسا کہ بیان ہوا(

امام علیہ السلام بھی دوسرے تمام انسانوں کی طرح بندۂ خدا ہیں اور دینی تکالیف وقوانین کے پابند ہیں اور خدا کی طرف سے رکھنے والی سرپرستی اور پیشوائی کے لحاظ سے عام انسانی معیاروں کے مطابق انھیں اعمال کو انجام دینا چاہئے اور کلمۂ حق اور دین کو احیاء کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہیے۔

اس ظمانہ کی اجمالی حالت کا ایک سرسری جائزہ لینے کے بعد حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے مقصد کے بارے میں فیصلہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔

تاریخ اسلام میں خاندان رسالت اور ان کے شیعوں پر جو تاریک ترین ایام گزرے وہ معاویہ کی بیس سالہ حکومت کا دور تھا۔

معاویہ نے خلافت اسلامیہ کو ہر نیرنگ سے اپنے قبضہ میں لے لیا اور وسیع اسلامی مملکت کا بے قید وشرط فرماں روا بن گیا۔اس نے اپنی تمام حیرت انگیز توانائیوں کو اپنی حکومت کو استحکام بخشنے اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کو نابود کرنے میں صرف کیا، نہ صرف یہ کہ انھیں نابود کرے بلکہ وہ چاہتا تھا لوگوں کی زبانوں اور دلوں سے ان کے نام ونشان تک کو محو کر دے۔

اس نے لوگوں کی نظروں میں محترم اور قابل اعتماد چند اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر قیمت پر اپنا حامی بنا کر ان کے ذریعہ صحابیوں کے حق میں اوراہل بیت علیہم السلام کی مخالفت میں احادیث جعل کرائیں۔اس کے حکم سے اسلامی مملکت کے تمام شہروں کے منبروں سے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام پر (ایک دینی فریضہ کے مانند) لعنت بھیجی جاتی تھی۔

وہ اپنے آلہ کار اور جاسوسوں، جیسے زیاد بن ابیہ، سمرۃ ابن جندب، بسر بن ارطاۃ وغیرہ کے ذریعہ محبان اہل بیتؑ کا ہر جگہ سراغ لگا کر انھیں نابود کرتا تھا اور اس راہ میں زر، زور، لالچ، ترغیب اور ڈرانے دھمکانے کی توانائیوں سے آخری حد تک استفادہ کرتا تھا۔

ایسے ماحول میں قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عام لوگ حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولاد کا زبان پر نام لینے سے نفرت کریں، اور جو لوگ اہل بیت علیہم السلام کی دوستی کا شائبہ تک دل میں رکھتے ہوں اپنی جان، مال اور آبرو پر آنچ آنے کے خوف سے اہل بیت علیہم السلام سے اپنا رابطہ منقطع کریں۔

حقیقت حال کو یہاں سے پایا جاسکتا ہے کہ سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کی امامت کی مدت تقریباً دس سال جاری رہی اور یہ پوری مدت (آخری کے چند ماہ کے علاوہ) معاویہ کی معاصر تھی۔ باوجود اس کے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام وقت کے امام اور تمام فقہ اسلامی میں معارف و احکام دین بیان کرنے والے تھے۔ لیکن اس پوری مدت میں آپؑ سے ایک حدیث بھی نقل نہیں کی گئی ہے۔(اس کا مقصود وہ روایت ہے جسے لوگوں نے حضرت سے نقل کی ہو، نہ وہ روایت جو حضرتؑ کے خاندان کے اندر حضرتؑ سے بعد والے ائمہؑ تک پہنچی ہو) اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں اہل بیت اطہار علیہم السلام کے گھر کا دروازہ بالکل بند کیا گیا تھا اور اس گھرانے سے لوگوں کی رفت و آمد نہ ہونے کی حد تک پہنچی تھی۔ روز افزوں گھٹن اور دباؤ کے بادل اسلامی ماحول پر ایسے چھائے تھے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کے خلاف جنگ جاری رکھنے یا اس کے خلاف انقلاب کرنے کی اجازت نہیں دی، اور اس کا کم ترین فائدہ بھی نہیں تھا، کیونکہ: سب سے پہلے: معاویہ نے آپؑ سے بیعت لے لی تھی، بیعت کے باوجود کوئی آپؑ کا ساتھ نہیں دیتا تھا۔

دوسرے یہ کہ: معاویہ نے اپنے آپ کو لوگوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک بڑے صحابی، کاتب وحی اور خلفائے راشدین میں سے تین افراد کے مورد اعتماد اور دست راست کے عنوان سے پہچنوایا تھا اور ''خال المومنین'' جیسے مقدس لقب کو اپنے آپ سے منسوب کر چکا تھا۔

تیسرے یہ کہ: اپنے مخصوص نیرنگ سے آسانی کے ساتھ اپنے کسی کارندہ کے ہاتھوں امام حسن علیہ السلام کو قتل کرا سکتا تھا اور اس کے بعد آپؑ کی خونخواہی کا پرچم بلند کر کے آپؑ کے قاتلوں سے انتقام لے کر آپؑ کے لئے مجلس عزا بھی منعقد کر سکتا تھا اور آپؑ کا عزادار بھی بن سکتا تھا!

معاویہ نے امام حسن علیہ السلام کی زندگی کے حالات یہاں تک پہنچائے تھے کہ آپؑ کسی صورت میں، حتی اپنے گھر کے اندر محفوظ نہیں تھے، بالآخر (جب لوگوں سے یزید کے لئے بیعت لینا چاہتا تھا) حضرتؑ کو آپؑ کی بیوی کے ہاتھوں زہر دلا کر شہید کرایا۔

وہی امام حسین علیہ السلام، جس نے معاویہ کے مرنے کے بعد فوری طور پر یزید کے خلاف انقلاب کیا برپا اور خود اور اپنے ساتھیوں، حتی اپنے شیر خوار فرزند کو بھی اس راہ میں قربان کیا، معاویہ کے زمانہ میں اپنی امامت کی پوری مدت کے دوران یہ قربانی پیش کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے، کیونکہ معاویہ کے ظاہراً حق بجانب نیرنگوں کے مقابلہ میں آپؑ کی شہادت کسی قسم کا اثر نہیں رکھتی۔

یہ تھا ان ناخوشگوار حالات کا ایک خلاصہ جسے معاویہ نے اسلامی ماحول میں پیدا کر کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کا دروازہ بالکل بند کر دیا تھا اور اس طرح اہل بیت اطہار علیہم السلام کو ہر قسم کے اثر ورسوخ سے محروم کر کے رکھ دیا تھا۔

آخری، کاری ضرب جواس نے اسلام و مسلمین کے پیکر پر لگائی، وہ یہ تھی کہ اس نے خلافت اسلامیہ کو ظالمانہ اور موروثی سلطنت میں تبدیل کیا اور اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کیا، جبکہ یزید کسی قسم کی دینی شخصیت (حتی ظاہر میں بھی) کا مالک نہیں تھا اور ہمیشہ علنی طور پر موسیقی، شراب نوشی اور بندر کے ساتھ کھیلنے میں وقت گزارتا تھا اور دینی قوانین کا کسی قسم کا احترام نہیں کرتا تھا، اور ان سب کے علاوہ دین پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا، چنانچہ جب اہل بیت علیہم السلام کے اسیروں اور کربلا کے شہیدوں کے سروں کو دمشق میں داخل کر رہے تھے، یزید ان کے تماشا کے لئے باہر آیا تھا، ایک کوّے کی آواز اس کے کان میں پہنچی اور اس نے کہا:

نعب الغراب قل او لا تقل فقد اقتضیت من الرسول دیونی ا۔

کوے نے آواز دی تم کہو یا نہ کہو یقیناً میں نے (آل) رسول سے اپنے قرضے پورے

ا۔ تفسیر روح المعانی، آلوسی، ص ۶۶، بہ نقل تاریخ ابن الوردی کتاب وافی الوفیات

کر لئے۔

اور اسی طرح جب اہل بیت علیہم السلام کے اسیروں اور حضرت سید الشہداء کے سر اقدس کو اس کے سامنے لایا گیا تو اس نے کچھ اشعار کہے اور ان اشعار میں سے ایک یہ تھا:

لعبت ھاشم بالملک فلا خبر جاء ولا وحی نزل

بنی ہاشم نے ملک حاصل کرنے کے لئے ایک کھیل کھیلا تھا نہ کوئی فرشتہ ان کے پاس آیا تھا نہ وحی نازل ہوئی تھی۔

یزید کی حکمرانی، جو معاویہ کی سیاست کو جاری رکھنے کی پالیسی پر مبنی تھی، اسلام اور مسلمین کی تکلیف کو واضح کرتی تھی اور اہل بیت رسول علیہم السلام کے مسلمانوں اور شیعوں سے رابطہ کی حالت (جسے مکمل طور پر فراموش کرانا تھا) کو عیاں کرتی تھی۔

ایسے شرائط میں اہل بیت علیہم السلام کی نابودی قطعی بنانے اور حق و حقیقت کی بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا تنہا وسیلہ اور موثر ترین عامل یہ تھا کہ سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام یزید کی بیعت کریں اور اسے خلیفہ اور پیغمبر اسلام کا واجب الاطاعت جانشین مان لیں۔

حضرت سید الشہداء علیہ السلام حقیقی پیشوا اور قیادت کے مالک ہونے کے پیش نظر ہرگز یزید کی بیعت نہیں کر سکتے تھے اور دین اسلام کو پائمال کرنے کے لئے ایسا موثر قدم نہیں اٹھا سکتے تھے، لہذا امام علیہ السلام کے لئے بیعت سے انکار کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا اور خدائے متعال بھی اس کے علاوہ کوئی چیز آپؑ سے نہیں چاہتا تھا۔

دوسری طرف سے بیعت کا انکار تلخ اور ناخوشگوار نتائج رکھتا تھا، کیونکہ وقت کی خطرناک اور مخالفت کو برداشت نہ کرنے والی حکومت اپنی پوری طاقت اور ھستی سے بیعت کا مطالبہ کرتی تھی (بیعت سر چاہتی تھی) اور اس کے علاوہ کسی بھی چیز پر تیار نہیں تھی اس لحاظ سے، بیعت سے انکار کرنے کی صورت میں امام علیہ السلام کا قتل ہونا قطعی اور انکار بیعت کا اٹوٹ لازمہ تھا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے اسلام و مسلمین کی مصلحت کے پیش نظر بیعت سے انکار کرنے اور قتل ہونے کا قطعی فیصلہ کیا اور کسی خوف کے بغیر موت کو زندگی پر ترجیح دی اور مشیت الٰہی بھی آپ کا بیعت سے انکار اور شہید ہونا تھا۔ (اور یہ ہے اس امر کا معنی جو بعض روایتوں میں نقل ہوا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خواب میں آپؑ سے فرمایا تھا: ''خدا تجھے قتل ہوتے دیکھنا چاہتا ہے'' اور حضرتؑ نے بھی اس تحریک سے منع کرنے

والے بعض افراد کو فرمایا تھا: ''خدا مجھے قتل ہوتے دیکھنا چاہتا ہے'' اور بہر صورت اس کا مقصود، مشیت تشریعی ہے نہ مشیت تکوینی، کیونکہ ہم نے اس سے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ خدا کی تکوینی مشیت ارادہ اور فعل میں کوئی اثر نہیں کرتی (

جی ہاں ! امام حسین علیہ السلام نے بیعت کا انکار اور (نتیجہ کے طور پر) اپنے قتل ہونے کا فیصلہ کیا اور موت کو زندگی پر ترجیح دی اور حوادث کے رونما ہونے سے حضرت ؑ کا صحیح نظریہ ثابت ہو گیا، کیونکہ اس دل خراش حالت میں آپ ؑ کی شہادت نے اہل بیت علیہم السلام کی مظلومیت اور حقانیت کو ثابت کر دیا ۔ آپ ؑ کی شہادت کے بعد بارہ سال تک تحریکوں اور خونریزیوں کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے بعد وہی گھر ، جس کے دروازہ کو حضرت ؑ کے زمانہ میں کوئی نہیں پہچانتا تھا، پانچویں امام ؑ کے زمانہ میں رونما ہوئے مختصر آرام کے نتیجہ میں اطراف و اکناف سے شیعہ سیلاب کے مانند اسی حقانیت و نورانیت کے دروازہ کی طرف دوڑ پڑے اور اس حقانیت اور نورانیت کی چمک دمک کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلانے کا سبب بنے۔ اس حقانیت کی مستحکم بنیاد اہل بیت علیہم السلام کی مظلومیت ہے اور اس میدان کے پیش رو سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام تھے۔ آج، امام حسین علیہ السلام کے زمانہ میں خاندان رسالت ؐ کی حالت اور لوگوں کی ان کی طرف توجہ کا، آپ ؑ کی شہادت کے بعد چودہ صدیوں کے دوران رونما ہوئے حالات کا موازنہ، جو روز بروز تازہ اور عمیق تر ہو رہے ہیں، کرنے پر حضرت ؑ کا صحیح نظریہ اظہر من الشمس ہو رہا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت ؑ نے بعض روایات کے مطابق جو شعر انشاء فرمایا ہے وہ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے:

وما ان طبنا جبن و لکن منایانا و دولت آخرینا

بزدلی اور خوف ہماری طبیعت میں شامل نہیں بلکہ ایسا ہے کہ ہمیں اس دنیا سے جانا چاہیے تاکہ دوسروں کی حکومت پا بر جا ہو۔

اسی لئے معاویہ نے یزید کو تاکید کی تھی کہ اگر حسین ابن علی علیہ السلام اس کی بیعت کرنے سے اجتناب کریں تو انھیں اپنے حال پر چھوڑنا اور کسی قسم کی مداخلت نہ کرنا معاویہ یہ وصیت اخلاص اور محبت کی بنا پر نہیں کر رہا تھا، بلکہ وہ جانتا تھا کہ حسین ابن علی علیہ السلام بیعت کرنے والے نہیں ہیں اور اگر وہ یزید کے ہاتھوں قتل ہو جائیں تو اہل بیت علیہم السلام پر مظلومیت کا نشان لگ جائے گا اور یہ اموی سلطنت کے لئے خطرناک اور اہل بیت علیہم السلام کے لئے تبلیغ اور پیش رفت کا بہترین وسیلہ ہو گا۔

سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام، بیعت سے انکار کرنے کے لئے اپنے الٰہی فریضہ سے آگاہ تھے اور بنی امیہ کی بے حد اور نا قابل مزاحمت قدرت اور یزید کی ذہنیت کے بارے میں سب سے بہتر آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ بیعت سے انکار کا اٹوٹ لازمہ، ان کا قتل ہونا ہے اور فریضہ الٰہی کی انجام دہی کا نتیجہ شہادت ہے۔ اس معنی کے بارے میں مختلف مقامات پر گوناگوں تعبیرات سے انکشاف فرماتے تھے۔

مدینہ کے گورنر کی مجلس میں جب آپ ؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا تو آپ نے ''فرمایا: ''مجھ جیسا'' یزید جیسے کی بیعت نہیں کرتا۔''

مدینہ منورہ سے رات کی تاریکی میں نکلتے وقت اپنے نانا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا کہ خواب میں آپ ؑ سے فرمایا'' خدا نے چاہا ہے (یعنی تکلیف کے عنوان سے) قتل ہو جاؤ گے''

مکہ سے عزیمت کے وقت کی گئی اپنی تقریر کے دوران کچھ لوگوں کی طرف سے آپ کو عراق کی طرف عزیمت سے منصرف ہونے کی تجویز کے جواب میں بھی مکرّر یہی مطلب بیان فرمایا۔

راستہ میں ایک عرب شخصیت نے حضرت ؑ کو کوفہ جانے کے اپنے ارادہ سے منصرف ہونے پر اصرار کیا اور کہا کہ منصرف نہ ہونے کی صورت میں حتماً قتل

کئے جاؤ گے، آپؑ نے جواب میں فرمایا: "یہ حقیقت مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن یہ لوگ مجھ کو چھوڑنے والے نہیں ہیں اور جہاں بھی جاؤں اور جہاں پر رہوں مجھے مار ڈالیں گے "

)اگرچہ ان میں سے بعض روایتیں قابل تردید یا سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں لیکن وقت کے حالات اور قضایا کا تجزیہ و تحلیل ان کی مکمل طور پر تائید کرتے ہیں(

البتہ ہم جو کہتے ہیں کہ "اپنے انقلاب سے امام علیہ السلام کا مقصد شہادت تھا اور خدائے متعال آپؑ کی شہادت چاہتا تھا" اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا نے آپؑ سے چاہا تھا کہ یزید کی بیعت سے انکار کریں اور اس کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر یزید کے کارندوں کو اطلاع دے کہ آکر انھیں قتل کر ڈالیں اور اس مضحکہ خیز طریقہ سے اپنا فریضہ انجام دیں اور اسے انقلاب کا نام رکھیں، بلکہ امامؑ کا فریضہ یہ تھا کہ یزید کی منحوس خلافت کے خلاف انقلاب قائم کریں، اس کی بیعت سے انکار کریں اور اپنے اس انکار کو ہر ممکن راہ سے آخر تک پہنچائیں جو شہادت پر منتہی ہو گی۔

یہاں پر ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ اپنے قیام کے دوران بدلتے حالات کے مطابق امامؑ کی روش مختلف تھی۔ ابتدائی مرحلہ میں جب مدینہ کے گورنر کے دباؤ میں قرار پائے تو رات کو مدینہ سے حرکت کی اور مکہ، حرم خدا اور جائے امن، میں پناہ لے لی اور مکہ میں کئی مہینے تک پناہ گزینی کی زندگی گزاری، آپ مکہ میں خلافت کے ماموروں اور جاسوسوں کے تحت نظر تھے یہاں تک فیصلہ لیا گیا کہ موسم حج میں ایک گروہ کے ذریعہ قتل کئے جائیں یا پکڑ کر شام بھیج دئے جائیں اور دوسری طرف عراق سے حضرتؑ کے نام خطوط کا ایک بڑا سلسلہ آنے لگا اور سیکڑوں اور ہزاروں خطوط میں آپؑ سے حمایت کا وعدہ دے کر عراق آنے کی دعوت دی گئی۔ جب اہل کوفہ کی طرف سے آخری خط بعنوان اتمام حجت (جیسا کہ بعض مورخین نے لکھا ہے پہنچا، تو حضرتؑ نے روانہ ہونے اور خونین انقلاب کا فیصلہ لیا۔ اوّل اتمام حجت کے طور پر اپنے نمائندہ حضرت مسلم ابن عقیل کو بھیجا۔ کچھ مدت کے بعد حضرت مسلم کی طرف سے انقلاب کے لئے حالات مناسب ہونے کا خط ملا۔

امام علیہ السلام نے مذکورہ دو عوامل، یعنی شام کے جاسوسوں کے آپؑ کو قتل کرنے یا پکڑنے کے لئے مکہ میں داخل ہونے کے پیش نظر، خانہ خدا کے احترام کے تحفظ اور عراقیوں کے انقلاب کے لئے آمادہ ہونے کی وجہ سے کوفہ کی طرف عزیمت فرمائی۔ اس کے بعد جب راستہ میں مسلمؑ اور ہانی کے بے دردی سے قتل کئے جانے کی خبر ملی تو حضرتؑ نے اپنے انقلاب اور جنگ کو دفاعی انقلاب میں تبدیل فرمایا اور اپنے ساتھیوں کی چھان بین کرنے لگے اور صرف ان افراد کو اپنے ساتھ رکھا جو اپنے خون کے آخری قطرہ تک وفا کرنے اور پیچھے نہ ہٹنے پر آمادہ تھے۔ ا۔

محمد حسین طباطبائی

قم۔ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ

۱۔مذکورہ بحث، چند سال پیش استاد علامہ طباطبائی کے توسط سے، ایک گروہ کے سوالات کے جواب کے طور پر لکھی گئی ہے۔

ساتواں حصہ :

وہابی عقائد کا باطل ہونا

کیاانبیاءاور اولیاءسے توسّل کرناشرک کی ایک قسم ہے ؟

سوال: کیا عقلی استدلال اور قرآن مجید کی آیات کے دلائل اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی واضح سیرت کے پیش نظر انبیاءؑ، ائمہؑ اور صالحین سے توسّل کرنا شرک اور کفر کا سبب نہیں ہو گا؟ اس لئے کہ :

سب سے پہلے : عقلی استدلال کے مطابق، خلقت صرف خدا سے مخصوص ہے اور ہر قسم کی تاثیر اسی سے ہے اور قرآن مجید بھی اسی معنی کی تصدیق کرتا ہے اور مکرّر فرماتا ہے :

...)اللہ خلق کل شي....)(رعد، ۱۶(

... ''اللہ ہی ہر شے کا خالق ہے''

اس بناء پر اسباب اور مسّببات کے درمیان کسی قسم کے ایجاد کا رابطہ اور تاثیر نہیں ہے بلکہ مشیت الٰہی یہ ہے کہ مسّببات کو اسباب کے پیچھے اور آثار کو صاحبان آثار کے بعد خلق کرتا ہے بدون اس کے کہ ان کے درمیان ہو، مثلاً لکڑی جلنے کو آگ کے پہنچنے کے بعد ایجاد کرے بدون اس کے کہ ان کے درمیان رابطہ موجود ہو اور اس بناپر انبیاء اور اولیاء کو ذاتی قدرت کا مالک اور اثر کا آغاز جاننا اور ان سے توسّل کرنا اور حاجت طلب کرنا انھیں خدا کا شریک قرار دینا ہے۔

دوسرے یہ کہ : خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے :

)وقال ربّکم ادعوني استجب لکم انّ الذین یستکبرون عن عبادتي سیدخلون جھنم داخرین)(غافر، ۶۰(

''اور تمہارے پروردگار کا ارشاد ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا اور یقینا جو لوگ میری عبادت سے اکڑتے ہیں وہ عنقریب ذلّت کے ساتھ جہنّم میں داخل ہوں گے''

چنانچہ آیت کے سیاق سے واضح ہے کہ خدائے متعال دعا کو عبادت شمار کرتا ہے اور عبادت اور دعا سے نافرمانی کرنے والے کو واضح طور پر جہنّم کا وعدہ دیتا ہے اور غیر خدا سے دعا مانگنا، عبادت اور خدا سے دعا کی نافرمانی قرار دیتا ہے اور یہ واضح طور پر غیر خدا کو خدا کا شریک قرار دینا ہے۔

تیسرے یہ کہ : رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیر مسلمانوں، یعنی بت پرستوں اور اہل کتاب کو اپنی دعوت میں عملاً کافر جانتے تھے اور ان سے جنگ کرتے تھے، جبکہ بت پرست خدائے متعال کو خالق و رزّاق اور عالم کا مدبّر جانتے تھے، ان کے شرک کی تنہا علت یہ تھی کہ گزشتہ انبیاء کی وفات کے بعد ان کی ارواح سے حاجت طلب کرتے تھے اور انھیں شفیع قرار دیتے تھے اور ان کا پاس رکھتے تھے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اہل کتاب اور بت پرستوں کے درمیان کسی قسم کا فرق کئے بغیر ان سب سے جنگ کرتے تھے اور ان سب کو کافر اور مشرک جانتے تھے۔

چوتھے یہ کہ : بہت سی آیات جیسے :

) قل لا یعلم من في السموات والارض الغیب الاّ اللہ...)(نمل، ۶۵(

''کہہ دیجئے کہ آسمان و زمین میں غیب کا جاننے والا اللہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے''..

اور :

)وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھاالّاھو...)(انعام،۵۹(

''اوراس کے پاس غیب کے خزانے ہیں جنھیں اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے''...

کے سبب علم غیب خدا کی خصوصیات میں سے ہے اوراس کے علاوہ کوئی علم غیب نہیں جانتا۔انبیاء،اولیاء وغیرہ،جو بھی ہو علم غیب نہیں رکھتے اور بدیہی ہے کہ دنیااہل آخرت کے لئے غیب ہے اور ہر انسان حتی انبیاءاوراولیاء بھی مرنے کے بعد دنیا کے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں،پس انبیاءاوراولیاء سے ان کے مرنے کے بعد حاجت طلب کرنااور شفاعت مانگنا،شرک ہونے کے علاوہ بیہودہ بھی ہے اوراسی طرح یہ آیت:

)یوم یجمعاالله الرسل فیقول،ماذااُجبتم قالوالا علم لناانک انت علاّٰم الغیوب)(مائدہ،۱۰۹(

''جس دن خداتمام مرسلین کو جمع کرکے سوال کرے گا کہ تمھیں قوم کی طرف سے تبلیغ کا کیاجواب ملاتووہ کہیں گے کہ ہم کیابتائیں توخود ہی غیب کا جاننے والا ہے''

اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ قیامت کے دن انبیاءان کی امت کے بارے میں کئے گئے سوال کے جواب میں بتائیں گے مرنے کے بعد ہم ان کے حالات سے بے خبر ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ان وجوہات کی بناءپر،اولیاءاور انبیاء سے ان کے مرنے کے بعد دعامانگنااوران سے حاجت طلب کرنابلکہ مطلق خضوع اوران کی قبروں کی تعظیم کرناحتیٰ ان کی ضریحوں اور قبروں کابوسہ لیناشرک ہے!

جواب :

بسمہ تعالیٰ

اماپہلی حجت:اس قول کالازمہ یہ ہے کہ عالم ہستی میں تاثیر میں نہ کوئی مستقل موثروجودرکھتاہے اورنہ تاثیر میں غیر مستقل واسطہ ہے بلکہ تاثیر مطلق طورپر خداسے مربوط ہے اور دوسرے الفاظ میں،موجودات میں علّیت ومعلولیت کاانکاراورعلّیت کاخدائے متعال سے مخصوص ہونے کی بات،اس کے علاوہ کہ انسان کی فطری عقل کے واضح طورپر خلاف ہے،ناقابل رفع دورکاوٹیں بھی اس میں موجود ہیں:

۱۔اس بات کو قبول کرنے سے خالق کائنات کے اثبات کاراستہ مکمل طورپر مسدود ہوتاہے،کیونکہ ہم خالق کائنات کے وجود کوعالم ہستی سے حاصل کی گئی معلومات کی بناپرثابت کرتے ہیں اور جب خارجی مخلوقات اوراسی طرح نظری وفکری معلومات میں،توقف وجودی اورعلّیت ومعلولیت موجود نہ ہو،توہم کہاں سے سمجھ سکتے ہیں کہ عالم کے مظاہر،عالم سے باہر(خالق کائنات کے نام)کسی چیز سے توقف وجودی اور رابطہ ہستی رکھتے ہیں اور کیایہ مضحکہ خیز نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ مشیت الٰہی اس پرجاری ہے کہ آثار کوصاحبان آثار کے بعد خلق کرے اور خداکوثابت کئے بغیر ہم اس کی مشیت کے بارے میں بات کریں؟

۲۔یہ کہ جب توقف وجودی اور ہر چیز کادوسری چیز سے رابطہ منقطع ہوجائے،توہر دلیل اوراس کے نتیجہ کے درمیان بھی رابطہ منقطع ہوتاہے اور کوئی دلیل اپنے نتیجہ کالازمہ نہیں ہوگی،کیونکہ اس صورت میں کسی دلیل اوراس کے نتیجہ کے درمیان کوئی رابطہ موجود نہیں ہوگااور یہ معنی نتیجہ کے علم سے جوڑنہیں کھاتاہے اوراس کالازمہ ہر چیز میں شک ہے،یعنی مغالطہ!

لیکن ہم انسانی فطرت کے مطابق،علیّت ومعلولیّت کے قانون کوعام اور قابل استثناء جانتے ہیں۔ہر مظہر اور حادثہ جس کاسابق عدم ہے،اس کاوجوداپنے

آپ سے نہیں ہے، بلکہ اس کے اوپر ایک علت ہوتی ہے اور اس طرح ان کی علّت اور اس کی علّت کی علّت اور سب علتیں (دور اور تسلسل کے باطل ہونے کی بنیاد پر اور دوسری عقلی دلیل کی وجہ سے "واجب الوجود" نام کی ایک علّت پر ختم ہو جاتی ہے، کہ وہ خدائے متعال ہے۔ اور نتیجہ کے طور پر عالم، عالم اسباب ہے اور تاثیر میں مستقل علت، تمام مخلوقات کے لئے خدائے متعال ہے اور خدائے متعال اور ایک "امکانی معلول" کے درمیان جو دوسری علتیں قرار پائی ہیں، وہ واسطہ ہیں اور ان کا فعل اور اثر بالکل خدا کا فعل واثر ہے۔

وجود کے فیض کا معلول تک پہنچنے میں کسی چیز کا واسطہ ہونا تاثیر میں شرکت اور استقلال کے علاوہ ہے۔ واسطہ اور ذی واسطہ سے ایک فعل کے استثناء کی مثال انسان کے مانند ہے کہ ہاتھ میں ایک قلم لیا ہوا کوئی چیز لکھتا ہے، اس فرض کے مطابق قلم لکھتا ہے، ہاتھ لکھتا ہے، انسان لکھتا ہے اور ہر تین چیزیں صحیح ہیں جبکہ لکھنا ایک فعل سے زیادہ نہیں ہے اور تین موضوع سے اس کی نسبت دی جاتی ہے، لیکن تاثیر میں مستقل لکھنے والا "انسان" ہے اور ہاتھ اور قلم واسطہ ہیں نہ شریک اور آگ اور اس کے جلانے کی مثال میں، خدائے متعال نے جلانے والی آگ کو خلق فرمایا نہ آگ کو الگ سے اور جلانے کو الگ سے ،یعنی جلانے کو آگ کی راہ سے خلق فرمایا ہے نہ مستقل طور پر اور الگ سے۔

مذکورہ بیان کے پیش نظر، علیّت اور معلولیّت جو مخلوقات میں امکانی ہیں، خدائے متعال کے استقلال خلقت اور پیدا کرنے میں اس کی وحدانیت سے کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتیں بلکہ اشیاء کی وساطت اور ان کی تائید اور تاکید کرنے والی ہیں، اور قرآن مجید بھی مخلوقات کو نسبت دینے والے اور احتیاجات میں انجام دینے والے تمام افعال وآثار میں، عام قانون علیّت و معلولیّت کی تصدیق کرتا ہے، اور اسی اثناء میں تاثیر میں استقلال کو خدائے متعال کے لئے محفوظ رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں قرآن مجید کی آیتیں بہت ہیں، جیسے :

...)ومارمیت اذرمیت ولکنّ اللہ رمیٰ...)(انفال ١٧(

..."آپ نے سنگریزے نہیں پھینکے ہیں بلکہ خدا نے پھینکے ہیں"...

...)قٰتلوھم یعذّبھم اللہ بأیدیکم...)(توبہ، ١٤(

"ان سے جنگ کرو اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے سزادے گا"...

...)انّما یرید اللہ لیعذّبھم بھا...)(توبہ، ٥٥(

..."بس اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ انھیں کے ذریعہ ان پر عذاب کرے"...

اور ایسی ہی دوسری آیتیں۔

لیکن دوسری حجّت : جو دعا کو عبادت بیان کرتی ہے۔ ہم نے پہلی حجّت کے جواب میں واضح کر دیا ہے کہ غیر خدا سے دعا کرنا اور حاجت طلب کرنا ،دو صورتوں میں قابل تصور ہے :

طرف کی تاثیر اور ذاتی قدرت کے ادعا سے حاجت طلب کرنا اور اس کے واسطہ سے حاجت طلب کرنے اور دعا کرنے کا اس کے ذی الواسطہ سے شریک ہونے میں کسی قسم کی مداخلت نہیں ہے، اس بنا پر آیہ کریمہ :

...)ادعوني استجب لکم ان الذین یستکبرون عن عبادتي سیدخلون جھنّم داخرین)(غافر، ٦٠(

..."مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا اور یقیناً جو لوگ میری عبادت سے اکڑتے ہیں وہ عنقریب ذلّت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے"

صرف اس دعا کی نہی کرتی ہے جو طرف مقابل کے تاثیر میں استقلال کے اعتقاد سے مربوط ہو، نہ کلی طور پر حاجت طلب کرنے کی، حتی واسطہ اور طریقہ جو صاحب واسطہ کا فعل اور اثر ہے اس سے حاجت طلب کرنا، مستقل سے حاجت طلب کرنا منظور ہوتا ہے، اس کے علاوہ آیہ کریمہ میں مطلق معنی لینا ایسے مواقع پیدا کرتا ہے کہ ان کا شرک نہ ہونا بدیہی ہے، اس کے مانند کہ مثلاً ہم ہر روز نانوائی سے کہیں کہ جناب! ان پیسوں کے برابر روٹی دے دیجئے اور اسی طرح قصاب سے گوشت، اپنے نوکر سے خدمت، اپنے مخدوم سے نظر عنایت اور اپنے دوست سے دوستی سے مربوط ایک کام کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ کیونکہ ان مطالبات کا دعا ہونا بدیہی ہے اور مطلق دعا کے شرک ہونے کی صورت میں مشکل واضح ہے ۔ اور یہ کہ بعضوں نے کہا ہے: چونکہ یہ زندہ ہیں اور مطالبہ کو سنتے ہیں، لیکن انبیاء اور اولیاء کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد جو دعا ان سے کی جاتی ہے وہ اس سے غافل ہیں، یہ صرف ان دعاؤں کے بیہودہ ہونے کی مشکل کو حل کرتا ہے نہ آیت میں دعا کے مطلق ہونے کی صورت میں شرک ہونے کی مشکل کو دور کرتا ہے ۔ اس بات کے باطل ہونے کی دلیل چوتھے سوال کے جواب میں بیان کی جائے گی ۔

اسی طرح آیہ کریمہ:

) یا ایّھاالذین آمنوااتّقوااللہ وابتغواالیہ الوسیلۃ وجاھدوافیسبیلہ لعلکم تفلحون)(مائدہ ۳۵(

''ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو کہ شاید اس طرح کامیاب ہو جاؤ''

میں خدائے متعال اپنی طرف وسیلہ تلاش کرنے کا حکم فرماتا ہے اور اسے کامیابی کے سبب کے طور پر بیان فرماتا ہے ۔ یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس روایت کے مانند ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایمان اور نماز کو اپنا وسیلہ قرار دیتے ہیں اور واضح ہے کہ وسیلہ کا مقصود یا ایمان و عبادت کے توسط سے تقرّب ہے یا خود ایمان و عبادت ہے ۔ اور بدیہی طور پر ایمان ایک نفسانی صفت اور عبادت انسان کی حرکت ہے اور جو بھی ہو غیر خدائے متعال ہے کہ اس کی سببیّت تصدیق ہوئی ہے جبکہ گزشتہ حجّت کی بنا پر یہ شرک ہے اور شرک کا خدا کے تقرّب کا سبب بننا محال ہے ۔

لیکن تیسری حجّت: جو کچھ بت پرستوں کے مشرک ہونے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ بت پرست شہادت دیتے تھے خدائے وحدہ لا شریک خالق اور رازق ہے اور اس کے علاوہ نہ کوئی زندہ کرتا ہے، نہ کوئی مارتا ہے نہ کوئی تدبیر کرتا ہے ۔ اور تمام آسمان اور زمین اور ان کے اندر موجود مخلوقات اس کے بندے اور اس کے کنڑول اور قدرت کے تحت ہیں، یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو حقیقت کے ساتھ میل نہیں کھاتا، کیونکہ ادیان اور مذاہب کی کتابوں کی نص کے مطابق اور کروڑوں کی تعداد میں چین، ھندوستان، جاپان اور دوسرے ممالک میں زندگی کرنے والے بت پرستوں کی گواہی کے مطابق بت پرست کا دین اس بنیاد پر ہے کہ وہ کہتے ہیں خلقت اور تمام کائنات کی پیدائش، حتی جن خداؤں کی وہ پرستش کرتے ہیں، خدائے متعال کی طرف سے ہے لیکن اس کی مقدس اور لا متناہی ذات ہمارے لئے حس، خیال اور عقلی طور پر قابل درک نہیں ہے اور کسی بھی صورت میں ہمارا ادراک اس کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتا ہے تاکہ ہم اس کی طرف توجہ کر سکیں، اس لحاظ سے کہ اس کی عبادت اور پرستش توجہ کے ساتھ ہونی چاہئے، ہمارے لئے ممکن نہیں ہے اور ہم ناچار ہیں اس کے بعض مقرّب اور قدرت مند بندوں کی پرستش کریں جو ملائکہ، جن، اور عالم بشریت کے مقدس افراد پر مشتمل ہیں تاکہ وہ ہمیں خدا کے نزدیک تر کر کے اس کے پاس ہماری شفاعت کریں ۔

بت پرستوں کی نظر میں ملائکہ ایک پاک و مقرّب مخلوق ہیں، جن کو عالم کے امور کا ایک حصہ ادارہ کرنے کے لئے سونپا گیا ہے اور مستقل اور مکمل اختیار کے مدبّر ہیں جیسے، سمندروں، صحرا، جنگ، صلح، زیبائی زمین اور آسمان کے خداوند ۔ ان میں سے ہر ایک خدا ایک حصہ کا مکمل اور مستقل اختیار رکھنے والا

مقرر ہوتا ہے اور تدبیر کرتا ہے۔ یہ خداؤں کا خدا، رب الارباب اور الہٰ الالھٰہ ہے اور امور عالم کی تدبیر سے کوئی چیز اس سے مربوط نہیں ہے۔ قرآن مجید میں بھی چند آیات اس مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہیں، جیسے آیہ شریفہ:

)ولئن سألتھم مَن خلق السموات والارض لیقولنّ اللہ۔۔)(لقمان، ۲۵(

''اور اگر ان سے سوال کریں کہ زمین وآسمان کا خالق کون ہے تو کہیں گے کہ اللہ''

)ولئن سألتھم مَن خلقھم لیقولنّ اللہ...)(زخرف، ۸۷(

''اور اگر آپ ان سے سوال کریں گے کہ خود ان کا خالق کون ہے تو کہیں گے اللہ، اور اسی طرح کی دوسری آیتیں جن میں بت پرستوں کے خدا کے خالق ہونے کا اعتراف ہے۔''

اور جیسے:

)لوکان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا)(انبیاء، ۲۲(

''یادرکھوا گر زمین وآسمان میں اللہ کے علاوہ اور خدا بھی ہوتے تو زمین وآسمان دونوں برباد ہوجاتے۔''

اور آیہ:

...)وماکان معہ من الہٍ اذاً لذھب کل الہ بما خلق ولعلا بعضھم علی بعض...)(مومنون، ۹۱(

...''اور نہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا خدا ہے ورنہ ہر خدا اپنی مخلوقات کو لے کر الگ ہوجاتا اور ہر ایک دوسرے پر برتری کی فکر کرتا''...

اس آیت کا استدلال یہ ہے کہ اگر متعدد خدا ہوتے، تو تدبیر میں اختلاف نظر پیدا ہوتا اور مختلف نظریات کو نافذ کرنے کے نتیجہ میں عالم میں اختلاف اور فساد پیدا ہو

جاتا۔ واضح ہے کہ اگر خداؤں کو تدبیر میں استقلال حاصل نہ ہوتا اور صرف خدائے واحد کے ارادہ سے واسطہ اور نافذ کرنے والے ہوتے تو اختلاف نظر وجود نہیں رکھتا تاکہ تدبیر میں اختلاف پیش آئے۔

مذکورہ بیان سے واضح ہوگیا کہ بت پرست، خواہ ستاروں اور ستاروں کی روحانیت کی پرستش کرتے ہیں یا وہ جو اصنام اور اصنام کے ارباب کی پرستش کرتے ہیں وہ ہرگز خدائے متعال کی پرستش نہیں کرتے ہیں اور عبادت اور تقرّب کے سلسلہ میں جو خاص مراسم اور قربانی انجام دیتے ہیں، وہ ان کے خداؤں سے مربوط ہیں اور خدائے متعال کے پاس صرف شفاعت کی امید رکھتے ہیں اور وہ بھی دنیوی زندگی کے امور کے بارے میں نہ آخرت میں شفاعت کے لئے، کیونکہ وہ معاد کے منکر ہیں اور قرآن مجید جو جواب انھیں اس آیت:

...)مَن ذا الذي یشفع عندہ الّا باذنہ...)(بقرہ، ۲۵۵(

.. ''کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرسکے''...

میں دیتا ہے، وہ مطلق شفاعت سے مربوط ہے نہ قیامت کے دن کی شفاعت سے جس کے وہ منکر ہیں۔

جی ہاں! اعراب، جاہلیت کے دوران جہالت میں غرق تھے، کبھی بت پرستی کے اصول کے خلاف خدائے متعال کی بھی عبادت کرتے تھے، من جملہ حج، جو حضرت ابراھیم علیہ السلام کے زمانہ سے ان کے درمیان رائج تھا، اس کے بعد جب عمرو بن یحیٰ نے حجاز میں بت پرستی کو رواج بخشا تو سب لوگ

بت پرست ہوئے۔ پھر بھی حج کو بجالاتے تھے،اس عمل کوانجام دینے کے ضمن میں کعبہ کے اوپر واقع '' ھبل'' اور صفاو مروہ پر موجود ''اساف ''و''نائلہ'' جیسے اپنے خداؤں کی زیارت کرتے تھے اور انھیں کی قربانی پیش کرتے تھے اور ان کا یہ جاہلانہ عمل عام بت پرستوں کے جاہلانہ عمل کے مانند تھا کہ بت کو قبلہ اور مظہر قرار دے کر صاحب بت، کہ مثلاً ملک ہے، کی پرستش کرنے کے بجائے اپنے ہاتھوں سے بنائے گئے بت کی پرستش کرتے تھے، چنانچہ خدائے متعال حضرت ابراھیمؑ کے کلام کو نقل کرتا ہے:

...)اتعبدون ماتنحتون)(صافات،۹۵(

''کیاتم لوگ اپنے ہاتھوں کے تراشیدہ بتوں کی پرستش کرتے ہو؟''

خلاصہ،بت پرستی کے اصول کے مطابق،اوراس تیسری حجت میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کے برعکس،خدائے متعال نہ امور عالم کا مدبر ہے اور نہ ملائکہ سے نسبت دی جانے والا معبود اور شفاعت ہے،شفاعت دینوی امور زندگی سے مربوط ہے اور ایک ایسی تدبیر کا جزء ہے کہ ملائکہ اس میں مستقل اور خود مختار ہیں نہ مذکورہ مثال کے مطابق واسطہ اور وسیلہ،ملائکہ اپنی تدبیر میں معمار کی حیثیت رکھتے ہیں کہ عمارت کا مالک ایک عمارت کی تعمیر کو اس کے حوالہ کرتا ہے،اس فرض میں عمارت کا ابتدائی مواد مالک مکان کے ذمہ ہے،جس چیز کی معمار کو عمارت کی تعمیر میں ضرورت ہو، جیسے،چونا ،پتھر،اینٹ وغیرہ مالک مکان کو یہ چیزیں فراہم کرنا ہوں گی اور ان کی ترتیب اور بناوٹ معمار کے ذمہ ہوتی ہے۔ہماری بحث میں شفاعت،معمار کے مطالبات کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی طرح تدبیر کا بھی جزو ہے،جو خداؤں کے ذمہ ہے۔

لیکن،جو کچھ اس تیسری حجت میں اہل کتاب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ انبیاء اور صالح بندوں کو مرنے کے بعد خدا کا شریک قرار دیتے تھے اور ان سے حاجت طلب کرتے تھے اور اس طرح مشرک ہوتے تھے،یہ ایک اور بے دلیل دعویٰ ہے... حقیقت میں اہل کتاب،یعنی یہود اور عیسائی وغیرہ عموماً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو مسترد کرنے کی وجہ سے کافر تھے،چنانچہ فرماتا ہے:

)انّ الذین یکفرون باللہ ورسولہ ویریدون ان یفرّقوا بین اللہ ورسولہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتّخذوا بین ذلک سبیلا*اولئک ھم الکافرون حقاً(

)نساء،۱۵۰۔۱۵۱(

''بیشک جو لوگ اللہ اور رسول کا انکار کرتے ہیں اور خدا اور رسول کے درمیان تفرقہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے اور چاہتے ہیں کہ ایمان و کفر کے درمیان سے کوئی نیا راستہ نکال لیں۔ تو در حقیقت یہی لوگ کافر ہیں''...

اسی طرح اپنے علماء کے بارے میں مطلق اطاعت کرتے تھے اور انھیں اپنا ارباب جانتے تھے،اور خدائے تعالیٰ اطاعت کو عبادت اور پرستش شمار کرتا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

)ألم أعھد الیکم یا بنی آدم ان لا تعبدوا الشیاطن انّہ لکم عدوّ مبین*وان اعبدوني...)(یسین،۶۰۔۶۱(

''اولاد آدم! کیا ہم نے تم سے اس بات کا عہد نہیں لیا تھا کہ خبر دار شیطان کی عبادت نہ کرنا کہ وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔اور میری عبادت کرنا''...

مزید فرماتا ہے:

)أفرأیت مَن اتّخذ الٰھہ ھویٰہ و أضلہ اللہ علی علم(...

)حاشیہ،۲۳(

"کیاآپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنالیا ہے اور خدانے اسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے"

چنانچہ واضح ہے کہ ان آیات میں اطاعت کو عبادت شمار کیا گیا ہے۔اوران دو طائفوں میں سے ہر ایک انحراف کی وجہ سے دین حق کی راہ سے ایک خاص کفر میں مبتلا ہوا تھا، چنانچہ یہود کہتے تھے:"عزیر ابن اللہ"اور عیسائی کہتے تھے:"المسیح ابن اللہ"اور مسیحؑ اور مریمؑ کی پرستش کرتے تھے، چنانچہ فرماتا ہے :

)واذ قال اللہ یعیسیٰ ابن مریم ءانت قلت للناس اتخذونی وامی الٰھین من دون اللہ..)(مائدہ،۱۱۶(

"اور جب اللہ نے کہا کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا تم نے لوگوں سے یہ کہدیا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو خدا مان لو؟"..

اور خدائے متعال مندرجہ ذیل آیہ شریفہ میں مجموعی طور پر ان جہتوں کی طرف اشارہ فرماتا ہے:

)وقالت الیھود عزیر ابن اللہ وقالت النصٰرٰی المسیح ابن اللہ ذلک قولھم بافواھھم یضٰھون قول الذین کفروا من قبل قٰتلھم اللہ انّی یوفکون * اتّخذوا احبارھم ورھبٰنھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما اُمروا الّا لیعبدوا الٰھا واحداً لاالہ الّا ھو...)(توبہ ۳۰۔۳۱(

"اور یہودیوں کا کہنا ہے عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں یہ سب ان کی زبانی باتیں ہیں۔ان باتوں میں یہ بالکل ان کے مثل ہیں جو ان کے پہلے کفار کہا کرتے تھے،اللہ ان سب کو قتل کرے یہ کہاں بہکے چلے جارہے ہیں۔ان لوگوں نے اپنے عالموں اور راہبوں اور مسیح بن مریم کو خدا کو چھوڑ کر اپنا رب بنالیا ہے حالانکہ انھیں صرف خدائے یکتا کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے"...

مجوسیوں کے بارے میں اگرچہ قرآن مجید میں تفصیلی بیان نہیں ہے لیکن ہم باہر سے جانتے ہیں وہ بت پرستوں کے مانند، فرشتوں کی پرستش کرتے ہیں صرف فرق یہ ہے کہ مجوس اصنام نہیں رکھتے تھے، بت پرستوں کے برعکس وہ ملائکہ کے لئے تصویر بناتے تھے اور "اصنام" کے نام پر انھیں ملائکہ کو دکھانے والا جانتے تھے۔

مذکورہ بیان سے واضح ہوا کہ قرآن مجید میں انبیاء اور صالحین سے حوائج کے بارے میں واسطہ اور رابطہ کی صورت میں توسل، نہ استقلال کی صورت میں ،ہر گز شرک بیان نہیں ہوا ہے اور یہ جو مشرکین اور اہل کتاب کہتے ہیں، جیسا کہ تیسری حجت میں کہا گیا ہے، نہیں تھے بلکہ واضح طور پر غیر خدا کو اپنا معبود جانتے تھے نہ شفاعت کے لحاظ سے بلکہ عبادت کے لحاظ سے اور خاص مراسم انجام دیتے تھے اور اس وقت بھی انجام دیتے ہیں۔

اصولی طور پر کوئی بھی اپنی انسانی فطرت سے واسطہ اور وسیلہ کو شرک نہیں جانتا ہے اور وسیلہ و واسطہ ایک ایسا راستہ ہے جو انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچاتا ہے اور بذات خود راستہ مقصد اور منزل نہیں ہے، جو کسی فقیر کے حق میں کسی مال دار کے پاس شفاعت کرتا ہے مثلاً اس سے کچھ پیسے لے کر فقیر کو دیتا ہے، کوئی عقلمند نہیں کہتا کہ وہ پیسے مال دار اور شفاعت کرنے والے کے ہیں بلکہ پیسے دینے والا مال دار ہے اور شفیع واسطہ اور رابطہ ہے، شفیع ہمیشہ نیاز مند اور حاجت مند کا تتمہ ہوتا ہے نہ حاجت پورا کرنے والے کا شریک۔

لیکن چوتھی حجّت:اس کا خلاصہ یہ ہے کہ " علم غیب اور ہر قسم کا مشاہدہ غیبی خدائے متعال سے مخصوص ہے اور غیر خدا سے اس کی نسبت دینا شرک ہے ،اس بناء پر انبیاء و اولیاء مرنے کے بعد دنیا کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں رکھتے ہیں، کیونکہ آخرت کی نسبت دنیا غیب ہے۔" یہ ایک ایسا مطلب ہے جو نص کے خلاف ہے۔قرآن مجید فرماتا ہے:

)عالم الغیب فلا یُظہر علی غیبہ احدا*الّا من ارتضی من رسول...)(جن،۲۶۔۲۷(

''وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا ہے۔ مگر جس رسول کو پسند کرلے''...

خدائے متعال،اس آیہ شریفہ میں غیب پر تسلط کو اپنے علاوہ نفی کرتا ہے اور اسی اثناء میں رسول کو استثناء قرار دیتا ہے اور استثناء کو دنیا اور غیر دنیا کے لئے مقیّد نہیں کرتا ہے،پس ممکن ہے کہ رسولؐ خدا اپنی زندگی میں یا اپنی موت کے بعد خدا کی مرضی اور الٰہی تعلیم کے مطابق غیب سے مطلع ہوں،اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں پر رسول کے علم غیب سے نفی ہوئی ہے،اس کے ہمراہ وحی کو اس کے ساتھ قرار دیا گیا ہے،مانند آیہ:

)قل ما کنت بدعاً من الرسول وما ادری مایفعل بی ولا بکم ان اتّبع الّا مایوحی الیّ...)(احقاف،۹(

''آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی نئے قسم کا رسول نہیں ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا میں تو صرف وحی الٰہی کا اتباع کرتا ہوں''...

اور فرماتا ہے:

...)ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسّنی السوء ان انا الّا نذیر وبشیر...)(اعراف،۱۸۸(

''اگر میں غیب سے باخبر ہوتا تو بہت زیادہ خیر انجام دیتا اور کوئی برائی مجھ تک نہ آسکتی۔ میں تو صرف صاحبان ایمان کے لئے بشارت دینے والا اور عذاب الٰہی سے ڈرانے والا ہوں''

اور سورۂ ابراھیم میں ان امتوں کے انکار کے جواب میں،جو اپنے پیغمبروں سے اعتراض کر کے بتاتے تھے کہ تم بھی ہماری طرح بشر ہو،پیغمبروں کے قول سے فرماتا ہے:

)قالت لھم رسلھم ان نحن الّا بشر مثلکم ولکنّ اللہ یمن علیٰ من یشاء من عبادہ...)(ابراھیم،۱۱(

''ان رسولوں نے کہا کہ یقیناً ہم تمہارے ہی جیسے بشر ہیں لیکن خدا جس بندہ پر چاہتا ہے مخصوص احسان بھی کرتا ہے''...

ان تمام آیتوں سے واضح تر حضرت مسیح علیہ السلام کی زبانی اپنی قوم سے خطاب کو نقل فرماتا ہے:

...)وانبئکم بما تاکلون وما تدّخرون فی بیوتکم ان فی ذلک لایۃ لکم...)(آل عمران،۴۹(

''اور تمھیں اس بات کی خبر دوں گا کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا گھر میں ذخیرہ کرتے ہو،ان سب میں تمہارے لئے نشانیاں ہیں''...

اس طرح آیت:

...)مبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد...)(صف،۶(

''اور اپنے بعد کے لئے ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں جس کا نام احمد ہے''

اسی طرح بہت سی روایتیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اطہار علیہم السلام سے آخر الزمان کے حوادث کی خبر کے عنوان سے نقل ہوئی ہیں

۔

اس بناء پر جو کچھ بیان ہوا،اس میں جو قرآنی آیات علم غیب اور معجزات کی قدرت وغیرہ جیسے امور کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نفی کرتی ہیں ،وہ سب استقلال اور ذاتی قدرت پر ناظر ہیں اور جو آیات اس کو ثابت کرتی ہیں وہ عنایت الٰہی اور خدائی تعلیم سے مربوط ہیں۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم میں علم غیب وحی کی راہ سے ائمہ اطہار علیہم السلام میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وراثت اور تعلیم کی راہ سے ہوتا ہے، چنانچہ روایتیں بھی اس معنٰی کی دلالت کرتی ہیں اور آیہ کریمہ:

)یوم یجمع اللہ الرسل فیقول ماذا اُجبتم قالوا لا علم لنا انک انت علاّم الغیوب)(مائدہ،۱۰۹(

''جس دن خدا تمام مرسلین کو جمع کر کے سوال کرے گا کہ تمھیں قوم کی طرف سے تبلیغ کا کیا جواب ملا تو وہ کہیں گے کہ ہم کیا بتائیں تو خود ہی غیب کا جاننے والا ہے''

کا اس معنی سے استدلال ہوا ہے کہ قیامت کے دن تمام انبیاء ان کی موت کے بعد ان کی امتوں کے اعمال کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کریں گے اور کہیں گے کہ ہم تو مرنے کے بعد اپنی امت کے حالات سے آگاہی نہیں رکھتے۔

اگر اس کا معنی یہ ہوگا کہ مرنے کے بعد امت کے اعمال ہمارے لئے غیب تھے اور ہم غیب سے بے خبر ہیں، تو امت کے اعمال کے بارے میں یہ مشکل موت سے پہلے بھی پیش آسکتی ہے، کیونکہ ہر عمل کی حقیقت اس کی صورت کے تابع نہیں ہوتی ہے، بلکہ خبر متواتر کے مطابق بلکہ بدیہی طور پر فاعل کی نیت کے تابع ہے۔ کہ یہ انسان کے باطن سے مربوط ایک امر ہے اور ہر انسان کا باطن دوسرے انسان کے لئے غیب ہے۔ اس بناء پر، چنانچہ مرنے کے بعد اپنی امت کے اعمال سے بے خبر ہوتے ہیں، قبل از مرگ بھی حقیقت اعمال، جو غیب ہیں، سے بے خبر ہوں گے، اس صورت میں دنیا میں ان کے اعمال کا شاہد قرار دینا، چنانچہ آیہ:

)وکنت علیہم شہیداً مادمت فیہم) (مائدہ،۱۱۷(

''میں جب تک ان کے درمیان تھا ان کا گواہ اور نگراں رہا''

اور آیہ:

...)ویتخّذ من کم شہداء...)(آل عمران، ۱۴۰(

...''اور تم میں سے بعض کو شہداء قرار دے''...

اور آیہ:

...)وجایء بالنبیین والشھداء...)(زمر،۶۹(

...''اور انبیاء اور شہداء کو لایا جائے گا''

اور آیہ:

...)ویقول الاشھاد ھولاء الذین کذّبوا علی ربّھم (

)ہود،۱۸(

...''ان لوگوں نے خدا کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا ہے''...

کا اطلاق پر دلالت کرنا، لغو اور بے معنی ہوگا۔

لہذا، آیہ شریفہ کا لازمی معنی یہ ہوگا کہ انبیاء کہتے ہیں ہم ایک ایسا علم نہیں رکھتے ہیں، جس کے ہم خود مالک ہوں، جو علم ہمارے پاس ہے، وہ ایسا علم ہے جو

تیرے پاس ہے اور تونے ہی ہمیں سکھایا ہے اور سادہ تر الفاظ میں، تو بہتر جانتا ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہی ہے جو تیرے پاس ہے اور تونے ہی ہمیں دیا ہے۔

اور لیکن یہ جو تیسری حجت کے ذیل میں کہا گیا ہے کہ انبیاءؑ اور ائمہؑ کی قبروں کے سامنے خضوع اور تعظیم کرنا اور ان کی قبروں اور ضریح کو چومنا شرک ہے۔ یہ ایک بے بنیاد بات ہے، کیونکہ قبور اور ان کے آثار شعائر اور ایسی نشانیاں ہیں جو خدا کی یاد دلاتی ہیں اور ان کا احترام خدائے متعال کا احترام ہے۔ خدائے متعال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرماتا ہے:

...)فالذین آمنوابہ وعزّروہ ونصروہ واتّبعواالنوّر الذیأنزل معہ اؤلٰئک ھم المفلحون)(اعراف،۱۵۷(

...''پس جو لوگ اس پر ایمان لائے، اس کا احترام کیا، اس کی امداد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے وہی در حقیقت فلاح یافتہ اور کامیاب ہیں۔''

خدائے تعالیٰ مطلق شعائر اور اپنی نشانیوں کے بارے میں فرماتا ہے:

...)ومَن یعظّم شعائراللہ فانّھا من تقوی القلوب)(حج،۳۲(

''جو بھی اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے گا یہ تعظیم اس کے دل کے تقویٰ کا نتیجہ ہوگی''

دوسری طرف سے اہم واجبات میں سے ایک خدائے متعال کی محبت ہے اور بدیہی ہے کہ شئے کی محبت شئے کے آثار و آیات کی محبت اور اس شئے سے اظہار محبت کا لازمہ ہوتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ ھدیٰ علیہم السلام خدائے متعال کے شعائر اور نشانیاں ہیں، ان کی محبت کرنا ضروری ہے، جیسا کہ قرآن مجید کی محبت کرنا ضروری ہے اور چومنا اظہار محبت کی ضروریات میں سے ایک ہے۔ کیا یہ کہا جاسکتا ہے ''حجر اسود'' پر ہاتھ ملنا اور اس کو چومنا شرک ہے اور خدائے متعال نے شرک کے مصادیق میں سے ایک مصداق کی وضاحت کر کے اسے قبول کیا ہے؟

اس بحث کے خاتمہ پر تعجب کرنا چاہئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اظہار محبت کو واضح شرک جاننے والے حضرات، مسئلہ توحید میں خدائے متعال کی صفات ثبوتیہ کو سات مانتے ہیں۔ (حیات، قدرت، علم، سمع، بصر، ارادہ اور کلام) وان حضرات کے بقول یہ سات صفتیں ذات سے خارج اور ذات خدائے متعال کے قدیم ہونے سے قدیم تر ہیں، یعنی ان صفات میں سے ہر ایک نہ ذات کا معلول ہے اور نہ ذات اس کا معلول ہے، یعنی یہ ذاتاً واجب الوجود ہیں اور نتیجہ کے طور پر سات صفات ثبوتیہ، ذاتاً سات واجب الوجود بن جاتے ہیں اور ذات اقدس الٰہی کے ساتھ آٹھ واجب الوجود بن جاتے ہیں اور یہ لوگ ان کے مجموعہ کی ''توحید'' کے نام پر پرستش کرتے ہیں اور پھر بھی توحید کا دعویٰ کر کے، خدائے واحد اور یکتا، اس کی نشانیوں اور شعائر کا احترام کرنے والوں کو مشرک کہتے ہیں!

آٹھواں حصہ :

وجود اور ماہیت

وجود اور ماہیت

''سوفسطائی'' یا وجود علم کے منکر

سوال: فلسفہ کی دنیا میں قدیم زمانہ سے آج تک، ہمیشہ ایسے افراد موجود تھے جو تمام چیزوں کو خیالی اور تصوراتی فرض کر کے کسی بھی حقیقت کے معتقد نہیں تھے، ان افراد میں سے بعض حتی اپنے شک پر بھی شک کرتے ہوئے مطلق طور پر علم کے وجود کے منکر ہوئے ہیں۔ البتہ اس گروہ کو دنیائے فلسفہ میں '' سوفسطائی'' کہتے ہیں ان کے دعوی کو باطل ثابت کرنے کے سلسلہ میں آپ سے ایک مختصر فلسفی اور علمی جواب کا تقاضا ہے۔

جواب: ہم ایسے افراد کے مقابلہ میں قرار پائے ہیں جو سوفسطائیت کے گرویدہ ہو کر کہتے ہیں: ہمارے اور ہمارے نظریہ کے علاوہ جس چیز کا بھی فرض کیا جائے حقیقت نہیں ہے بلکہ خیال کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس سے بالاتر قدم بڑھا کر کہتے ہیں: میرے اور میرے نظریہ کے علاوہ سب چیزیں خیالی اور افسانوی ہیں ان میں سے بھی آگے بڑھ کر کچھ لوگ کہتے ہیں: ہم سب چیزوں میں شک کرتے ہیں حتی اسی اپنے شک میں بھی شک کرتے ہیں!

یہ وہ لوگ ہیں جو وجود علم کے منکر ہیں اور '' سوفسطائی'' کے نام سے معروف ہیں۔ علم فلسفہ کے مباحث میں ان کا مذہب مسترد ہوا ہے اور ''علم'' کا وجود ثابت ہو چکا ہے اور یہ اظہر من الشمس ہے کہ انسان اپنی خداداد فطرت سے حقیقت پسند اور خارجی اور مستقل حقیقت کا معتقد ہے۔

ہم، سوفسطائیوں کے مقابلہ میں، کسی حقیقت کوثابت کرنے والے، حقیقت کے لئے بہت سے مصادیق کے قائل ہیں کہ ان میں سے ہر ایک مصداق دوسرے سے ممتاز ہے اور اپنے خاص آثار کا سر چشمہ رکھتا ہے۔ خارجی اشیاء میں سے ہر ایک کی اپنے سے غیر کی نسبت ایک ممتاز حقیقت ہوتی ہے اور آثار مرتب کرنے کا اس کا اپنا ایک خاص سر چشمہ ہوتا ہے۔ اسی حالت میں خارج میں دکھائی دینے والی ہر ایک حقیقت دو مفہوم کا مصداق ہوتی ہے جو اس سے علیحدہ ہوتے ہیں اور ان دو مفاہیم میں سے ہر ایک کے زائل ہونے سے فرض کی گئی حقیقت معدوم ہو کر باطل ہوتی ہے۔

ماہیت و وجود: موجودہ انسان ایک ایسی حقیقت ہے، کہ اگر اس سے انسانیت سلب کی جائے یا موجودیت کو اٹھالیا جائے تو اس کی حقیقت ختم ہو جائے گی ، لیکن اسی حالت میں یہ دو بنیادی مفاہیم ایک دوسرے سے متفاوت ہوتے ہیں، کیونکہ ''وجود'' اور ''عدم'' ایک دوسرے کے نقیض ہیں اور محال ہے ''وجود''، ''عدم'' کے ساتھ جمع ہو جائے۔ اس کے برعکس ''ماہیت'' وجود اور عدم میں سے ہر ایک کے ساتھ قابل توصیف ہے۔

اسی طرح دونوں مفاہیم کے مصداق ذاتاً اصل (یعنی ان کے آثار کے مرتب ہونے کا سر چشمہ) نہیں ہیں ورنہ ہر خارجی حقیقت دو حقیقتیں ہوتیں، پس ان دو مفاہیم میں سے ایک ذاتاً اصلی اور آثار کا سر چشمہ ہوگا اور دوسرا اتفاقی طور پر اصل اور حقیقت سے بہرہ مند ہوگا اور دوسرے الفاظ میں، ان دو مفاہیم میں سے ایک کے مطابق دوسرے کی عین حقیقت اس کے ساتھ متحد ہونے کے ذریعہ، حقیقت ہوتی ہے جب کہ اپنی ذات کی حد میں اعتباری ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ماہیت اصل ہے یا وجود؟ اس کے پیش نظر کہ خارجی حقیقتیں موجود ماہیتیں ہوتی ہیں، جب اصل اور آثار کے سر چشمہ سے مرتب ہو جائیں اور مفہوم (موجود) آثار کا مرتب ہونا ان سے جدا ہو جائے تو وجود و عدم کی نسبت ماہیت اپنی ذات کی حد میں مساوی ہوتی ہے، اس صورت میں کہنا چاہئے کہ اصل وجود ہے نہ ماہیت۔

ان دو استدلالوں سے وجود کی اصلیت اور اصلیت کے بارے میں بیان کئے گئے دوسرے اقوال کا باطل ہونا واضح ہوتا ہے، مثلاً ماہیت کی اصلیت اور وجود کی اعتباریت کا قول، کیونکہ عقل کے واضح حکم کے مطابق جس ماہیت کی حقیقت اور عدم حقیقت سے نسبت مساوی ہو، اسے عین حقیقت اور اصل نہیں کہا جا سکتا ہے۔

اس کے مانند کہ کہا گیا ہے کہ واجب الوجود میں ممکن ماہیت اصل ہے اور جیسے کہا گیا ہے کہ واجب الوجود میں ممکن خلقت اصل ہے، جبکہ ہم واجب اور ممکن کی خلقت سے ایک معنی سمجھتے ہیں جو آثار کے مرتب ہونے کا سر چشمہ ہے اور اس بناپر دو لفظ وجود اور تخلیق آپس میں مترادف ہیں اور اس قول کی حقیقت ایک نام سے زیادہ نہیں ہے۔

وجود میں شک: ابتدائی طور پر جاننا چاہئے کہ علمائے منطق نے ابتدائی اور سطحی طور پر کلّی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے

: ''متواطی'' اور ''مشکک''۔ متواطی: ایک ایسی ماہیت ہے کہ اس کے افراد مذکورہ ماہیت کی صداقت کی حثیت سے مساوی ہیں انسان کے مفہوم کے مانند کہ اس کے افراد انسان کے مفہوم کی صداقت کی حیثیت سے مساوی ہیں اور اگر کوئی تفاوت پیش آئے تو وہ عوارض کی وجہ سے ہوتی ہے جو انسان کے مفہوم سے خارج ہوتے ہیں، مانند لمبائی، چوڑائی، وزن، جوان اور بوڑھا وغیرہ اور مشکّک: ایک ایسی ماہیت ہے کہ اس کے افراد مذکورہ کلی کی صداقت کی حیثیت سے آپس میں متفاوت ہوتے ہیں، جیسے، نور، کہ اس کے افراد شدّت اور ضعف کی حیثیت سے مختلف اور متفاوت ہیں اور اس شدّت اور صعف میں اختلاف اور تفاوت، نور کی نورانیت کی وجہ سے ہے۔ شدید نور اپنی نورانیت میں شدید ہے نہ نورانیت کے خارجی معنی میں اور اسی طرح ضعیف نور بھی

-

عام محسوسات، اصل میں، مشکّک ہیں ہم قوۂ باصرہ سے نور کو درک کرتے ہیں اور مصداق کی حیثیت میں مختلف ہوتے ہیں اور اپنی حیثیت سے ان کا اختلاف نورانیت ہے جیسا کہ اشارہ ہوا۔ اور اسی طرح، لمبائی، چوڑائی اور دور و نزدیک میں رکھنے والے اختلاف اور خود ابعاد اور کمیت میں رکھنے والے اختلاف، کے پیش نظر ہم ابعاد اور مسافتوں کو درک کرتے ہیں۔ اور قوۂ سامعہ ہم آوازوں کو سنتے ہیں اور انھیں شدید اور شدید تر اور ضعیف اور ضعیف تر پاتے ہیں اور یہ اختلافات خود آواز میں مسموع ہیں نہ ایک عارضی معنی میں قوۂ شامہ سے بو کو سونگتے ہیں جبکہ ان میں معطر و معطر تر اور بدبو و بدبو تر اور بالآخر شدید و ضعیف ہے کہ یہ اختلاف رایحہ کی ماہیت میں ہے۔ قوۂ ذائقہ سے ہم مزہ چکھتے ہیں اور ان میں شرین و شرین تر اور تلخ و تلخ تر اور ترش و ترش تر ہیں اور ان کا اختلاف خود ان کے مزّہ میں ہے نہ ماہیت سے خارج کسی امر میں قوۂ لامسہ سے ہم ملموس چیزوں کو پاتے ہیں اور ان کے درمیان گرم و گرم تر اور سرد و سرد تر اور سخت و سخت تر اور نرم و نرم تر ہیں اور اسی طرح تمام یہ اختلافات صرف معنای ملموس میں ہیں۔

جی ہاں! سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مشککہ ماہیات میں ایک اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے، خود ماہیت میں اس مفہوم کے معنی میں کہ ماھو کے جواب میں واقع ہوتا ہے اختلاف نہیں پایا جاتا ہے بلکہ یہ اختلاف مصداق کی صداقت میں ہوتا ہے۔ مثلاً ''خواندگی'' کا مفہوم، شدید اور ضعیف میں کسی تغیر و اختلاف کے بغیر وہی ''خواندگی'' کا مفہوم ہے بلکہ ''خواندگی'' جو دخارجی میں خود شدید یا ضعیف ہے، یعنی وجود میں تشکیک ہے نہ ماہیت میں مفہوم کی حیثیت سے، ان لوگوں کا مقصود یہی ہے، جو کہتے ہیں: تشکیک غرض میں ہے نہ عرض میں۔

اس طرح تشکیک ثابت ہوتی ہے، لیکن وجود میں نہ ماہیت میں۔ اور یہ جو بعض افراد نے کہا ہے: تشکیک معقول نہیں ہے، کیونکہ اس کا معنی نہیں ہے کہ ایک ہی شئے شدید بھی ہو اور ضعیف بھی بالجملہ صفات متقابلہ سے متصف ہو، یہ شخص کے واحد عددی اور واحد بالعموم میں خلط ہے اور شخص میں صفات متقابلہ سے توصیف ہونا محال ہے نہ واحد بالعموم میں۔

اس بحث سے واضح ہوتا ہے کہ مشکک ایک ایسی حقیقت ہے جو ذات کی حد میں قابل اختلاف ہے اور دوسرے الفاظ میں خود مصادیق میں تفاوت رکھتے ہوئے ما بہ الاختلاف سے ما بہ الاتفاق کی طرف پلٹتی ہے۔

اس مقدمہ کے بیان کے بعد ہم کہتے ہیں: اس کے پیش نظر کہ وجود کا مفہوم، جیسا کہ بیان ہوا، ایک ایسا مفہوم اور واحد ہے جو وحدت کی بنا پر تمام موجودات پر حمل ہوتا ہے۔ وجود کی حقیقت جو خارجی حقیقت کے آثار کا مرتب شدہ اس مفہوم و مرحلہ کا مصداق ہے، منفرد حقیقت اور ایک قسم ہے اور یہی منفرد حقیقت اپنے مصادیق میں وجوب، امکان، علیّت، معلولیت، وحدت، کثرت، قوت اور فعل وغیرہ کی حیثیت سے رکھنے والے اختلافات کے پیش نظر محقق ہے، ایک مشکک حقیقت ہے اور ذاتی شدت وضعف کے لحاظ سے اس کے مختلف مراتب ہیں۔

یہاں پر واضح ہوتا ہے کہ ایک جماعت سے نسبت دیا گیا قول، یعنی ''وجود'' ایک مشترک لفظ ہے اور ہر ماہیت کا وجود اسی ماہیت کے معنی میں ہے، کیونکہ ''وجود'' کا مفہوم ''عدم'' کا نقیض ہے اور وجود عدم سے نسبت ماہیت ایک مساوی نسبت ہے عقل کے واضح حکم سے ان دو اضداد میں سے کسی سے ایک واضح طور پر متصف ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے اور اگر ماہیت کا وجود اس ماہیت کے معنی میں ہو، تو اس کا لازمہ یہ ہوتا ہے کہ نقیضین میں سے ایک کے دوسرے مفہوم کے نقیض سے ملنا جائز ہے۔ اور یہ معقول نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ قول مصداق سے مفہوم کے اشتباہ میں سے ہے اور اتحاد ماہیت و وجود کے مصداق اور اتحاد ماہیت اور وجود کے مفہوم کے درمیان خلط ہے۔ اور اسی طرح واجب اور ممکن کے درمیان وجود کے مشترک لفظی کا غلط ہونا اور یہ کہ واجب میں وجوب کا مفہوم معنی کی حیثیت سے ممکن میں وجود کے مفہوم سے مختلف ہونا۔

اور یہ قول بھی اپنے عیوب کے پیش نظر مصداق کے مفہوم کی طرح اشتباہ ہے اور جو اختلاف واجب اور ممکن کے درمیان ہے وہ وجود کے مصداق (عینی حقیقت اور آثار کے مرتب ہونے کا مرحلہ) میں ہے نہ وجود کے مفہوم میں۔

بعض نے جو یہ کہا ہے: خارجی وجود تمام الزامات کے حقائق متباینہ ہیں، بھی اسی طرح ہے اور اس قول کے عیب کا سبب کثیر مصادیق سے کثیر کے مانند واحد مفہوم کے نکلنے کا لازمہ ہے جو محال ہے۔

ماہیت کا وجود سے متصف ہونا: چنانچہ گزشتہ بحثوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں دکھائی دینے والی موجودات میں سے ہر ایک، ایک ایسی واحد حقیقت ہے جو دو مفاہیم، وجود اور ماہیت سے جدا ہونے کا سرچشمہ ہیں اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ ان دو مفاہیم بالذات میں سے ایک کا مصداق اصل اور حقیقت ہو اور دوسرا اس کے غرض میں اصلیت اور حقیقت سے بہرہ مند ہو جائے۔ اور اس کے پیش نظر کہ آثار کا مرتب ہونا اصلیت کا معیار ہے، وجود کے علیٰحدہ ہونے پر منحصر ہے، اصلیت وجود سے متعلق ہے اور ماہیت اس کے عرض سے، تحقق و اصلیت سے بہرہ مند ہوتی ہے اور اپنی ذات کی حد میں اعتباری ہے

۔

البتہ اس بنا پر ماہیت کی اعتباریت کا معنی یہ نہیں ہے کہ کوئی امر خیال اور وہم تھا اور مطلق سے گر کر اس کا موطن صرف خیال اور تصور ہو بلکہ ماہیت ایک خارجی موجود ہے، جو کچھ ہے، وہ یہ ہے کہ عین حقیقت اور بالذات اصلیت نہیں ہے بلکہ عرض سے وجود کی اصلیت ہے اور حقیقت کے مطابق ماہیت، وجود کی سرحد ہے کہ جو اپنے وجود کو دوسروں کے وجود سے جدا کرتی ہے۔

یہیں پر ایک دوسرے قول کا باطل ہونا واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ماہیت سے خارجی وجود میں خارجیت سے تحقق رکھتا ہے ورنہ ایک خیال کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

باطل ہونے کا سبب یہ ہے کہ وجود ذہنی کی دلیل کی وجہ سے ماہیت ذہنی ماہیت خارجی کا وجود ذہنی ہے کہ اپنی ذات کی حیثیت سے عین ماہیت خارجی، اور احکام و آثار واقعی کے لئے ایک عقلی موضوع ہے اور اگر ہم ایک وہم اور خیالی ہو گا تو اصلی ماہیت خیالی ہو گی اور کلی طور پر حقیقت (حتی حقیقت بالعرض) کو بھی کھو دے گی۔

اس کے علاوہ، ''قضایای حقیقیہ'' جو افراد '' محققۃ الوجود'' اور '' مقدرۃ الوجود'' میں شامل ہیں، خیالی مفاہیم میں تبدیل ہو کر، کلی طور پر علوم باطل ہوں گے، مثلاً طبیب جو اپنی طبابت میں کہتا ہے: ہر انسان کا دل ہے یا فلاسفر کہتا ہے: ہر انسان نفس اور بدن کا مرکب ہے، اس سے مراد صرف انسان کے افراد ہوں گے جنھیں کہنے والے نے خارج میں مشاہدہ کیا ہے اور کہنے والے کے گزرنے کے ساتھ ختم ہوتا ہے اور اس صورت میں علم اپنی علمیت سے گر جائے گا۔ ان احکام کے علاوہ خود ماہیت بھی وجود ذہنی اور خارجی سے صرف نظر کرتے ہوئے خود ماہیت کے عوارض ذاتی ہوتے ہیں، ان کی جنسیت، فصلیت، ذاتیت اور عرضیت وغیرہ ختم ہوں گی۔

جی ہاں! غالباً یہ لوگ ذہنی وجود میں خیالی تصویروں کے قائل ہیں، اور جس صورت علمیّہ کو خارجی مصداق دکھائی دیتا ہے، اسے ایک ایسی تصویر کے مانند جانتے ہیں جیسے دیوار پر ایک گھوڑے کی تصویر کھینچی گئی ہے اور اسے دیکھنا انسان کو خارج میں ایک گھوڑے کی یاد دلائے!

لیکن اس قول کا باطل ہونا واضحات میں سے ہے، جبکہ ہمارا ادراک ایک نقشہ اور تصویر کے علاوہ کچھ حاصل نہیں کرتا ہے اور صاحب تصویر کو خارج میں درک کرنے میں بالکل محروم ہیں تو یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ تصویر کو درک کرنے سے صاحب تصویر کے خارجی وجود کو حاصل کر سکیں، جبکہ

صاحب تصویر کے خارجی وجود سے کسی صورت میں کوئی خبر نہیں رکھتے ہیں، اس لئے یہ خیالی قول، واضح طور پر مغالطہ ہے۔

نواں حصہ :

اسلام کی ایک پہچان

اسلام کی ایک پہچان

مباہلہ کا عمومی ہونا

سوال: مسئلہ "مباہلہ" کے بارے میں آپ نے تفسیر " المیزان" میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ہمارے زمانہ میں بھی ہر مومن مسلمان یہ کام انجام دے سکتا ہے، یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا ہر مسلمان جو ظاہر میں مومن ہو ایسا خطرناک کام انجام دے سکتا ہے؟

جواب: آیہ مباہلہ کے بارے میں، کہ مباہلہ عمومی حق رکھتا ہے اور مباہلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نجران کے نصاریٰ سے مخصوص نہیں ہے ،واضح ہے اور جو روایتیں اس سلسلہ میں اہل بیت اطہار علیہم السلام سے نقل ہوئی ہیں، وہ مباہلہ کے عمومی ہونے کی وضاحت کرتی ہیں۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے متعہ کی مشروعیت وشرعی جواز کے بارے میں "عبداللہ بن عمیر لیثی" کے ساتھ اپنے مناظرہ میں عبداللہ بن عمیر کو مباہلہ کی دعوت دیتے ہیں۔ اور اسی طرح ایک اور روایت میں امام علیہ السلام بعض اہل سنت کے مذہبی مناظرہ کرنے والے ایک شیعہ کو اپنے مدمقابل سے مباہلہ کرنے کا حکم فرماتے ہیں، اس بناء پر، مباہلہ ایک عمومی آیت ہے جسے خدائے متعال نے حق کا محافظ قرار دیا ہے۔

قرآن مجید کا تحریف سے پاک ہونا

سوال: قرآن مجید کی عدم تحریف کے بارے میں جناب عالی کا نظریہ کیا ہے؟

چونکہ ایک شیعہ عالم دین نے ماضی میں تحریف قرآن کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جو نجف اشرف میں منتشر بھی ہوئی ہے۔ مہربانی کر کے

فرمایئے:

سب سے پہلے: ہم مخالفین کو کیا جواب دیں گے؟

دوسرے یہ کہ: مذکورہ کتاب میں موجودہ روایتوں کو ہم کیسے جھٹلائیں گے؟

جواب: تحریف قرآن کے بارے میں بہت سی روایتیں سنّی اور شیعہ راویوں سے نقل ہوئی ہیں اور بعض راویوں نے ان پر اعتماد بھی کیا ہے لیکن خود ان روایتوں کی حجیّت ان کی عدم حجیّت اور مسترد ہونے کا لازمہ ہے۔ کیونکہ ان روایتوں کی حجیت، امامت اور ان کے قول کی حجیّت پر منتہی ہوتی ہے کہ یہ روایتیں ان سے منقول ہیں اور امامت ان کے قول کی حجیّت، نبوت اور قول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر منتہی ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نصوص سے امامت اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے قول کی حجیت ثابت ہوتی ہے اور نبوت و نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کی حجیت ،قرآن مجید کی آیات کے ظواہر پر منتہی ہوتی ہے، جو نبوت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کی حجیّت کی دلیل ہے۔ اور بدیہی ہے کہ تحریف قرآن کے فرض کے پیش نظر، کم یا زیادہ یا تغییر لفظ یا ایک جملہ اور حتی پورے قرآن میں ایک حرف کی کمی کے معنی میں، قرآن مجید کا ظہور حجیّت سے گر جاتا ہے اور نتیجہ کے طور پر نبوت اور قول نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حجیّت کی بھی کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ اور اس کا لازمہ قول امام کی حجیّت کا سقوط ہوگا اور اس کا لازمہ تحریف کے بارے میں روایتوں کی حجیّت کا سقوط ہوگا۔ لہذا تحریف کے بارے میں روایتوں کی حجیّت لازمہ ان کی عدم حجیّت ہوگی۔

نبی اکرمؐ کے فعل اور قول میں سہو کا نہ ہونا

سوال: علمائے معاصر میں سے ایک شخص نے ''سہو النبی'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھ کر بالآخر وہ کام انجام دیا ہے، جسے مرحوم ''صدوق'' انجام دینا چاہتے تھے افسوس ہے کہ اس کی تالیفات میں سے ایک کے آخر میں اس کے اپنے دستخط سے یہ مقالہ منتشر بھی ہوا ہے! اصولی طور پر اس موضوع کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟ اس کے علاوہ اس قسم کے مسائل پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

جواب: بدیہی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فعل آپ کے قول کے مانند تبلیغ کے مصادیق میں سے ہے اور سہو بھی خطا کے مصادیق میں سے ہے، لہذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اقوال یا افعال اور اعمال میں سہو تبلیغ میں خطا ہے اور معارف واحکام الٰہی کی تبلیغ میں خطا خدائی حجّت کے نامکمل ہونے کا امکان پیدا کرتا ہے اور اس کا لازمہ کتاب وسنّت کا حجیّت سے سقوط ہے، کیونکہ اس فرض کی بناء پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے جاری ہونے والے ہر بیان میں سہو اور اس کے حقیقت کے مطابق نہ ہونے کا امکان موجود ہے۔

قرآن مجید اور تسبیح سے استخارہ کرنے کی سند

سوال: کیا قرآن مجید اور تسبیح سے استخارہ کرنے کی کوئی سند ہے؟ کیا قرآن مجید فال دیکھنے کی کتاب ہے؟ یا تسبیح کے دانے انسان کی تقدیر کو بدل سکتے ہیں؟ بعض مومنین ہر کام کے لئے، صلاح ومشورہ سے پہلے کیوں استخارہ کا سہارا لیتے ہیں؟ کیا یہ امر لوگوں کی مذہبی تعلیم وتربیت میں خامی کا نتیجہ نہیں ہے؟

جواب: قرآن مجید اور تسبیح سے استخارہ کرنے کے بارے میں ائمہ اطہار علیہم السلام سے چند روایتیں نقل ہوئی ہیں اور ان روایتوں کو مسترد کرنے کا کوئی عقلی یا نقلی مانع موجود نہیں ہے۔ ان روایات سے قطع نظر استخارہ کا شیوہ یہ ہے کہ جب انسان ایک کام کے بارے میں اسے انجام دینے یا ترک کرنے کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے، تو اس کام کے اطراف میں اس کو انجام دینے اور ترک کرنے کی ترجیحات پر غور کرتا ہے اور کام کو انجام دینے یا ترک کرنے کی ترجیحات میں سے ایک کو پسند کر کے اس پر عمل کرتا ہے۔ اگر غور وفکر کی راہ سے ترجیح نہ دے سکا تو اس سلسلہ میں دوسروں سے صلاح ومشورہ کر کے تر

جیحات میں سے جس کے بارے میں مشورہ ملا ہو اس پر عمل کرتا ہے۔اور اگر صلاح و مشورہ کی راہ سے بھی ترجیح نہ دے سکا اور کام کے دونوں طرف یعنی انجام اور ترک مساوی رہے اور حیرت میں پڑ گیا، تو قرآن مجید کو اٹھا کر خدا کی طرف توجہ کر کے اسے کھول کر پہلی آیت کے مضمون کو اپنے لئے ترجیح جان کر اس پر عمل کرے، یعنی کلام اللہ کو سند قرار دے کر خدا پر توکل کر کے دو مساوی ترجیحات جو دونوں اس کے لئے جائز تھے، میں سے ایک کو ترجیح دیتا ہے ۔اور یہ کام جو توکل کے مصادیق میں سے ہے، نہ اس میں کسی قسم کا شرک ہے اور نہ دینی احکام میں سے کسی کو ضرر پہنچاتا ہے اور نہ کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرتا ہے۔ یہ استخارہ قرآن مجید سے ہو یا تسبیح سے، خدا کی یاد کے وسائل میں سے ایک ہے اور حقیقت میں خدا پر توکل ہے نہ قرآن یا تسبیح کو خدا کا شریک قرار دیا جاتا ہے۔

مصحف حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کے بارے میں ایک بات

سوال: حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے مصحف کے بارے میں، شیعوں سے منسوب بعض افراد نے کچھ مطالب لکھ کر ''کویت'' میں منتشر کیا ہے ،جو مسلمانوں کی نفرت کا سبب بنے ہیں، کیونکہ کتاب کے مولف نے، مصحف فاطمہ سلام اللہ علیہا کو قرآن مجید کے کئی گنا بیان کیا ہے اور یوں اظہار کیا ہے کہ یہ مصحف قرآن مجید کے درجہ کا ہے !اس سلسلہ میں آپ کا نظریہ کیا ہے ؟

جواب: ''مصحف فاطمہ ؑ'''کے نام کی کتاب، جسے حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا نے املاء فرمایا اور امیر المومنین علی علیہ السلام نے اسے لکھا ہے، اہل بیت علیہم السلام کی روایتوں میں اس کا ذکر ہوا ہے۔اس قسم کی کتاب کا وجود (اس کے وجود کا اعتقاد) نہ مذہب شیعہ کی ضروریات میں سے ہے اور نہ خود یہ کتاب دینی منابع و مصادر کی حیثیت سے بیان ہوئی ہے اور نہ ائمہ معصومینؑ یا علمائے امامیہ میں سے کسی نے اصول دین یا مذہب یا دینی احکام کے بارے میں کوئی چیز اس سے نقل کر کے اسے دینی اسناد میں سے ایک سند کے طور پر کتاب و سنت کی سطح پر قرار دیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں، جیسا کہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ خلقت کے اسرار اور مستقبل کے حوادث کے بارے میں بحث ہے اور ایسی کتاب کے وجود پر اعتقاد رکھنا، خواہ قرآن مجید سے چھوٹی ہو یا بڑی ، کوئی نقصان نہیں پہنچاتا ہے۔البتہ مصحف فاطمہؑ سے، نعوذ باللہ، ایک دوسرے قرآن کا وجود ہر گز مقصود نہیں ہے اور کوئی شیعہ اس قسم کا اعتقاد نہیں رکھتا ہے۔

ائمہ اطہارؑ کے بارے میں غلو کرنا جائز نہیں ہے

سوال: شیعہ فقہ میں، ائمہ اطہار علیہ السلام کے حق میں غلو کرنا جائز نہیں ہے اور تمام فقہا کے مطابق غلو کرنے والے دین سے خارج، کافر اور نجس ہیں، اس مضمون کا کیا معنی ہے ؟اور ہم غلو کرنے والوں کو کیسے پہچان لیں ؟ کیا آپ کی نظر میں زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ''غالی'' کا مفہوم دوسرے عناوین کے تحت ظاہر نہیں ہوا ہے ؟

جواب: اصطلاح میں '' غالی'' اس کو کہتے ہیں، جو اہل بیت اطہار علیہم السلام میں سے کسی ایک کو، مثلاً بندگی کی حد سے اوپر لے جا کر ربوبیت کی بعض خصوصیت جیسے خلقت، تدبیر عالم اور تکوین میں بلاواسطہ تصّرف کو ان سے نسبت دے اور زمانہ گزرنے کے ساتھ یہ معنی کسی بھی صورت تحقق پیدا کرے، تو کوئی فرق نہیں ہے اور یہ کفر کا سبب ہے۔ جس چیز کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو کفر کا سبب بنتا ہے وہ خدا کی خصوصیات میں بلاواسطہ اور آزادانہ طور پر اعتقاد رکھنا ہے، جیسے اشیاء کو بلاواسطہ پیدا کرنا، بندوں کو بلاواسطہ رزق دینا وغیرہ۔امّا ولایت تکوینی کے سبب سے تکوینیات کے بعض ممکنات کے لئے فیض کا واسطہ ہونا، جیسے میکائیلؑ کا رزق پہنچانے میں اور جبرئیلؑ کا وحی پہنچانے میں اور ملک الموت کا ارواح کو قبض کرنے میں

وغیر واسطہ قرار پانا غلو سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے۔

''للہ درّ فلان'' اور ''کان للہ رضاً'' کے معانی

سوال: نہج البلاغہ میں بعض مواقع پر بعض خلفاء کے بارے میں ''للہ در فلان'' یا ''للہ بلاء فلان'' جیسے جملات درج ہیں۔اور معاویہ کے نام ایک خط میں خلفاء کے ساتھ بیعت کی کیفیت کو ''کان اللہ رضا'' کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور بعض دوسرے مواقع پر، من جملہ خطبہ ''شقشقیہ'' میں انہی افراد کی مخالفت میں بعض مطالب بیان ہوئے ہیں، جناب عالی کی نظر میں ظاہراً ان دو متناقض امور میں جمع کی صورت کیا ہے؟

جواب: جملہ ''وکان للہ رضا'' کا سیاق ''وللہ در فلان'' اور ''للہ بلاء فلان'' والے جملوں سے مختلف ہے، اور اس کا معنی اس چیز کی دشمنی کا لازمہ ہے جس کا ظاہر اً پابند ہوتا ہے اور امت کے اجماع کو خدا کی رضامندی جانتا ہے اور اگر یہ جملہ خود حضرتؑ کے بارے میں ہو، تو اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے اسلام کی مصلحت کے پیش نظر مجبور ہو کر بیعت کی ہے اور اس بیعت سے خدائے متعال راضی تھا، کیونکہ بیعت سے انکار کی صورت میں اسلام کی بنیاد نابود ہونے والی تھی۔

لیکن، ''للہ در فلان'' اور ''للہ بلاء فلان'' کے جملے بعض خلفاء اور مختلف شہروں میں مامورین کے بعض حاکم اور کارندوں پر اطلاق رکھتے ہیں ۔اور دوسرے معنی کی بناء پر کوئی مشکل نہیں ہے اور پہلے معنی کی بناء پر اس کے پیش نظر کہ شیعہ طریقہ سے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام اور تمام ائمہ اطہار علیہم السلام سے نقل ہوئی سیکڑوں اور ہزاروں روایتوں (جن میں سے ایک خطبہ شقشقیہ ہے) کے مطابق خلافت بلافصل امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا قطعی حق تھا، اس لئے حضرت علیہ السلام جو خلافت کو اپنا خاص حق جانتے تھے، سے دوسروں کی روش کی تمجید میں اس قسم کے جملوں کا بیان ہونا، صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی بلند مصلحتوں کا لحاظ رکھنے کے لئے ہوگا، یہ وہی مصلحتیں تھیں جن کے پیش نظر امام علیہ السلام کو ۲۵ سال تک صبر کرنا پڑا۔

اتحاد اور محبت کی دعوت

سوال: تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے مسلمانوں کی مصلحتوں کے تحفظ کے لئے خلفائے ثلاثہ کی بیعت کی ہے، اس صورت میں صدر اسلام میں مقام ومنزلت پانے والے افراد پر سب اور لعن کرنے کا کیا حکم ہے؟

کیا ہم حضرت علی علیہ السلام سے بھی دین دار تر بن کر، علی علیہ السلام کی راہ کے بر خلاف اسلام کی مصلحتوں کو نظر انداز کر کے غیر علمی اور غیر مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دیں؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم۔عالی سطح پر۔علمی بحث کے حامی ہیں، لیکن کینہ رکھنا اور مسلمان بھائیوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے میں کیا فائدہ ہے اور مذہبی نقطہ نظر سے اس کی کیا صورت ہے؟

ہم نے عملی طور پر مشاہدہ کیا ہے کہ قاہرہ میں (''دار التقریب بین المذاہب الاسلامیہ'' کی تاسیس اور مرحوم آیت اللہ العظمی بروجردی اور آیت اللہ العظمی کاشف الغطاء اور دیگر شیعہ علماء کی تائید کے درخشاں نتائج نکلے جن میں الازہر اسلامی یونیورسٹی کے چانسلر ''شیخ محمود شلتوت'' کا مذہب شیعہ پر عمل کرنے کو جائز قرار دینے کا فتویٰ قابل ذکر ہے کیا بہتر نہیں کہ ہم اسی راستہ پر آگے بڑھتے اور علمی مباحث کو بلند سطح پر جاری رکھیں، سنّیوں اور شیعوں کے خود غرض اور شر پسند گروہوں کو سرگرمیوں کی اجازت نہ دیں تاکہ اسلام کے دشمن ان اختلاف سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں؟

جواب: اگر اتحاد یا اسلامی تقریب دینی معارف کی فراموشی اور مذہبی احکام کے متروک ہونے کا سبب نہ بنے اور اس میں دین کے لئے بھلائی ہو تو عقل

ومنطق کے لحاظ سے اس کی ترجیح میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے صدر اسلام میں قرآن مجید کی تعلیمات کی پیروی کرنے کے نتیجہ میں جو توانائی حاصل کی تھی اور جس کے سبب ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں ایک بڑے علاقہ پر حکومت برقرار کی تھی، اختلاف کلمہ اور اجتماعی فکر کو چھوڑنے کے نتیجہ میں یہ حیرت انگیز توانائی مکمل طور پر منحل ہو کر مسلمانوں کا حقیقی سرمایہ اور موجودیت نیست ونابود ہوئی۔

البتہ اسلام کے ان دو بڑے فرقوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے عوامل کے بارے میں جاننا چاہئے کہ ان دو گرہوں کا اختلاف فروعات میں ہے اور اصول دین میں آپس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتے ہیں اور حتی دین کے ضروری فروعات، مانند: نماز، روزہ، حج، جہاد وغیرہ میں بھی یہ دونوں گروہ آپس میں اتفاق نظر رکھتے ہیں اور ایک ہی قرآن اور کعبہ پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

اسی اصول پر صدر اسلام کے شیعوں نے ہرگز اپنے آپ کو اکثریت سے جدا نہ کیا اور اسلام کے عمومی امور کی پیش رفت کے لئے عام مسلمانوں کے ساتھ شرکت کرنے کی کوشش اور کشادہ دلی کی نصیحت کرتے تھے۔ اس وقت بھی تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ دین مقدس اسلام کے اصولوں پر اتفاق کو مد نظر رکھتے ہوئے، اس طولانی مدت کے دوران اجنبیوں اور اسلام دشمن عوامل کی طرف سے برداشت کئے جانے والے دباؤ اور تکالیف کے پیش نظر ہوش میں آئیں اور باہمی اختلاف کو چھوڑ کر ایک صف میں کھڑے ہو جائیں اور اس سے قبل کہ دوسرے اس مسئلہ کو ایک تاریخی حقیقت کے عنوان سے کشف کر کے اپنی کتابوں میں درج کریں، خود مسلمان اس حقیقت کو عملی طور پر ثابت کریں۔

خوش قسمتی سے دنیائے اسلام آہستہ آہستہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتی جارہی ہے۔ تقریب مذاہب کی فکر کی اسی غرض سے شیعہ مراجع نے تائید کی ہے اور ''الازہر'' کے بزرگوار شیخ شلتوت نے بھی اس حقیقت کو بالکل واضح طور پر بیان کر کے، شیعہ اور سنی کے مکمل دینی اتفاق کا تمام دنیا والوں کے لئے اعلان کیا ہے اور شیعوں کو اس بزرگوار شخصیت کا شکر گزار رہنا چاہئے اور اس کے اس بے لوث کام کی قدر کرنی چاہئے۔

جیسا کہ سوال میں اشارہ ہوا ہے کہ یہ امر عقیدتی مسائل میں علمی اور تاریخی بحث سے منافات نہیں رکھتا ہے اور عالی سطح پر شیعہ وسنی علمی مباحثہ جاری رہنا چاہئے تاکہ لوگوں کے لئے تاریکیاں روشن اور حقائق واضح ہو جائیں اور اس امر کا، تعصب، حملہ اور جھوٹ پھیلانے سے کوئی ربط نہیں ہے۔

ہم خدائے متعال سے دعا کرتے ہیں کہ خود غرض اور شر پسند عناصر کی ہدایت اور اصلاح فرمائے اور مسلمانوں کو یہ توفیق عطا کرے کہ وہ عملی طور پر اتحاد واتفاق سے اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کریں۔ انہ سمیع مجیب۔

مشرق وسطی میں انبیاء کی بعثت

سوال: انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا صرف سعودی عربیہ، مصر، شامات اور انہی علاقوں تک محدود ہونا اور دنیا کے دوسرے علاقوں (یورپ۔ آسٹریلیا) وغیرہ سے مربوط نہ ہونے کا سبب کیا ہے؟

جواب: ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ انبیاء صرف مشرق وسطی اور اس سے مربوط علاقوں میں مبعوث ہوئے ہیں۔ بلکہ ظاہر آیہ (... خلافیھانذیر) اعدم انحصار پر دلالت کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقریباً بیس سے زائد جن انبیاء کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے وہ مشرق وسطیٰ اور اس کے علاقوں سے مربوط ہیں۔

۱۔ ''کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس پر کوئی ڈرانے والا نہیں گزرا ہو'' (فاطر، ۲۴(

استعدادوں میں فرق

سوال: قابلیتوں کے اختلافات کا سرچشمہ اور خلقت کے وقت مخلوقات کی استعداد آپس میں متفاوت ہیں، مثال کے طور پر ایک نبوت یا ولایت کا فیض پاتا ہے اور دوسرے ایسے نہیں ہوتے۔ اسی طرح تمام مخلوقات میں بھی یہ اختلافات پائے جاتے ہیں، ان اختلافات کی علت کیا ہے؟

جواب: استعداد مطلق مادّہ کی ذاتی خصوصیت ہے اور یہ مختلف شرائط کے ساتھ

مختلف تعینات پیدا کرتا ہے، مثلاً مادّہ، جسمیّت اور عنصریت کے شرائط کے تحت نباتاتی استعداد رکھتا ہے اور نباتات زمین اور ہوا کے شرائط کے تحت میوہ کی قابلیت اور میوہ تغذیہ کی شرط کے تحت نشو و نما کی قابلیت اور منی خاص حیوان کے رحم میں قرار پانے کی شرط کے تحت، خاص حیوانوں کی صورت کی قابلیت پیدا کرتی ہے۔ مادّہ کی فاعلی علّت کو مادہ اور طبیعت کے ماورئ میں ثابت کرنا چاہئے لیکن کلی طور پر اس سوال کو اختلافات کی علت غائی کی نسبت کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ قابلیتوں کے اختلاف، جن کے اختلاف کا سرچشمہ فیض ہے، کی غرض کیا ہے؟ کیا فرق پڑتا اگر خدائے متعال فیض کو عمومی فرماتا اور دنیا میں، شر، فساد اور کمی کا وجود نہ ہوتا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کائنات کی خلقت کا مقصد، مکمل ترین موجودات کی پیدائش ہے جو ''انسان کامل'' ہے

...) خلق لکم مافي الارض جمیعا...) (بقرہ، ۲۸(

...''زمین کے تمام ذخیروں کو تم ہی لوگوں کے لئے پیدا کیا ہے''...

)وسخّر لکم مافي السماوات ومافي الارض جمیعا...) (جاثیہ، ۱۳(

''اور اسی نے تمہارے لئے زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو مسخر کر دیا ہے''

انسان کا ارتقاء امتحان کی راہ میں ہوتا ہے، لہذا دنیا میں مختلف استعدادوں کا ہونا ضروری ہے، ورنہ امتحان کا کوئی معنی نہیں ہوگا۔

حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے متعلق بعض شبہات

سوال: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جناب خضر علیہ السلام کے قضیہ میں کشتی کو

توڑنے میں غیر کے مال میں تصرف اور غلام کے قتل میں جرم سے پہلے قصاص معلوم ہوتا ہے اور دیوار کے نیچے خزانہ سے کیا مراد ہے؟ حضرت خضر علیہ السلام کیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معلم بن گئے، جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس رسالت کا عہدہ تھا اور اپنے زمانہ میں معرفۃ اللہ کا مقام رکھتے تھے اور اسی طرح روبیل نامی چرواہا کا حضرت یونس علیہ السلام کو موعظہ کرنا اور ھدھد کا حضرت سلیمان علیہ السلام سے گفتگو کرنا کہ (احطت بمالم تحط بہ) ۱ اور چیونٹی کا یہ کہنا: (...وھم لایشعرون) ۲۔

جواب: کشتی کو توڑنے اور قتل جیسے ہزاروں حوادث قضا و قدر الٰہی کے مطابق روزانہ دنیا میں رونما ہوتے ہیں اور ان میں غیر کے مال میں تصرف اور جرم سے پہلے سزا کا خدائے متعال سے ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ خدائے متعال مطلق مالک اور مشرّع

۱۔ ''مجھے ایک ایسی بات معلوم ہوتی ہے جو آپ کو بھی معلوم نہیں ہے''(نمل، ۲۲(

۲۔ ''اور انھیں اس کا شعور بھی نہ ہو''(نمل، ۱۸(

ہے نہ متشرّع اور مکلّف، وہ جو بھی کام انجام دے عین عدل اور بالکل مصلحت ہے چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام کے کلام :(...وما فعلتہ أمری...)۱ ''میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کیا ہے...'' سے معلوم ہوتا ہے، کہ جو کام حضرت خضر علیہ السلام نے انجام دئے ہیں ان کا صرف تکوینی پہلو تھا نہ تشریعی پہلو یعنی خدا کے حکم سے ان تین کاموں میں، جو انہوں نے انجام دئے، صرف تکوینی سبب مقصود تھا اور ان کی مصلحت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا دی جائے، نہ تشریعی سبب جو حرام بن جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے، خدائے متعال بعض امور کی مصلحتوں کی تعلیم حضرت خضر علیہ السلام کے ذریعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دی اگرچہ موسیٰ علیہ السلام ان سے افضل بھی ہوں یا روبیل چرواہے کی زبان سے حضرت یونس علیہ السلام تک کوئی موعظ پہنچا دے۔

اسی طرح ھدھد کی گفتگو جو اس کے لئے بلقیس اور ملک سبا کے حالات کا مشاہدہ کرنے کا ثبوت اور حضرت سلیمان کے لئے اس کی نفی کی ہے، کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح چیونٹی کی گفتگو میں دوسری چیونٹیوں کو حضرت سلیمان علیہ السلام اور اس کی فوج کے ذریعہ پائمال ہونے سے بچنے کی خبر دنیا اور اس میں غفلت کے ثابت ہونے کی وضاحت میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۱۔ (کہف، ۸۲(

تشریعی اور اعتباری ولایت

سوال: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام علیہ السلام کی تشریعی اور اعتباری ولایت کا کیا مقصد ہے، جو آپ نے تفسیر ''المیزان'' میں آیہ شریفہ :(انّما ولیکم اللہ..)۱ کے سلسلہ میں فرمایا ہے۔؟

جواب: اس کا مقصد دینی قوانین (اسلامی حکومت) کے سایہ میں لوگوں کی سرپرستی اور امت کا نظم و نسق چلانا ہے۔

انذار (ڈرانے) کے معنی

سوال: آیہ شریفہ :(ما من دابّۃ فی الارض...الّا امم امثالکم (...

اور آیہ شریفہ :(الا خلا فیھا نذیر)۲ کے مطابق کیا حیوانات اور پرندے بھی مکلّف ہیں؟ اس انداز کا مقصود کیا ہے؟

جواب: انذار کا مقصد عذاب الٰہی سے ڈرانا ہے اور الٰہی دعوت اسی پر مشتمل ہوتی ہے، لیکن دوسری آیت، میں موجود قرینہ (وان من قریۃ...)۳ کے مطابق حیوانات اور پرندوں پر مشتمل نہیں ہے۔

سوال: آیہ شریفہ (انّ عبادي...)۴ کی روسے آدم پر شیطان کا وسوسہ کرنا، آیہ شریفہ (ان اللہ اصطفیٰ آدم...)۵ سے ہم آہنگی نہیں رکھتا ہے ! اس

۱۔ انعام، ۳۸ ۲۔ فاطر، ۲۴

۳۔ اسراء، ۵۸ ۴۔ اسراء، ۶۵

۵۔ آل عمران، ۳۳

سلسلہ میں آپ کا جواب کیا ہے ؟

جواب: آیہ شریفہ:

)قلنا اهبطوا منها جميعا فإما يأتينّكم مني هدى) (بقرہ، ۳۸ (

''اور ہم نے یہ بھی کہا کہ یہاں سے اتر پڑو پھر اگر ہماری طرف سے ہدایت آجائے''...

کے مطابق دین کی تشریع، جنت سے نکلنے کے بعد تھی۔ اور آیہ شریفہ: (ان عبادی لیس لک علیهم سلطٰن...)۱ میں دین کی تشریع کے بعد دنیا میں بندوں کے حال کی طرف اشارہ ہے اور اسی طرح آدم کا اصطفیٰ ہونا بھی آیہ شریفہ: (ثم اجتبٰه ربه فتاب علیه وهدیٰ)۲ کے مطابق دنیا میں اور دین کی تشریع ہو نے کے بعد تھا اور آدم علیہ السلام پر شیطان کا وسوسہ بہشت میں زمین پر بھیجنے اور دین کی تشریع سے پہلے تھا اور اس میں معصیت کا کوئی ولائی پہلو موجود نہیں تھا بلکہ ایک امر ارشادی کی مخالفت تھی، لہذا آیات کریمہ میں کوئی منافات نہیں ہے۔

حروف مقطعات کا مقصود

سوال: سوروں کی ابتدا میں حروف مقطعات کے بارے میں تفسیر '' المیزان'' میں کچھ نہیں پایا، مہربانی کر کے فرمایئے کہ یہ موضوع تفسیر کی کس جلد میں ہے اور اصولی طور پر حروف مقطعات کا مقصد کیا ہے ؟

جواب: سوروں کی ابتدا میں موجودہ حروف مقطعات کے بارے میں سورۂ

۱۔ حجر، ۴۲

۲۔ طہ، ۱۲۲

شوریٰ میں بحث کی گئی ہے ، اطمینان واعتماد کے مطابق حروف مقطعات ''رمز'' ہیں۔

قطبین پر نماز گزار اور روزہ دار کا فریضہ

سوال: قطبین (قطب شمالی اور قطب جنوبی) پر نماز اور روزہ کے اوقات کا کیسے تعین کیا جائے گا؟

جواب: فقہا کا نظریہ یہ ہے کہ قطبین کے باشندے اپنی عبادت کے اوقات کے لئے علاقہ کے وسط کی پیروی کریں، چنانچہ اجتماعی امور اور اوقات کو معین کرنے میں اسی رویہ کو معمول جانتے ہیں۔

شق القمر کے بارے میں ایک شبہ کا ازالہ

سوال: کیا قرآن مجید اور روایات کے مطابق معجزۂ ''شق القمر'' کا موضوع اور اس کا ثابت ہونا، کرۂ چاند کی وسعت کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آستین مبارک کی وسعت سے عدم مناسبت اور منطق کے قواعد اور انسانی عقل وادراک کی روسے ظرف کے مظروف سے عدم مطابقت کے

پیش نظراس کادو ٹکڑے ہونا صحیح ہے؟جواب:"شق القمر" کی داستان ایک قابل اعتماد حقیقت ہے جو قرآن مجیداور روایتوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے ،البتہ جو روایتیں اس قصہ کو بیان کرتی ہیں ان میں اختلاف ہے۔اس لحاظ سے کہ ان روایتوں میں سے ہر ایک خبر واحد ہے اور تنہا ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے، لہذا ان روایتوں میں سے ہر ایک میں ذکر شدہ خصوصیات پر بھروسہ کر کے موضوع پر بحث نہیں کی جاسکتی ہے اور جو کچھ کلی طور پر معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشارہ سے معجزہ کے طور پر چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے اور یہ وہی امر ہے جس کی طرف قرآن مجید بھی اشارہ فرماتا ہے:

قرآن مجید سورۂ قمر کی ابتدا میں فرماتا ہے:

)اقتربت الساعۃ وانشقّ القمر)(قمر،۱(

"قیامت قریب آگئی اور چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے"

یہ ایک خارق عادت کام ہے جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (رسالت کے بعض منکرین کی درخواست پر جو آپ کی نبوت کی گواہی کے لئے معجزہ چاہتے تھے) انجام دیا ہے۔بدیہی ہے کہ جب ہم نے معجزہ اور غیر معمولی کام کے ممکن ہونے اور اس کے پیغمبر سے انجام پانے کو قبول کیا، تو ایک خاص معجزہ کے انکار کی، خاص کر قرآن مجید (جو خود ایک معجزہ ہے) کی تائید کے بعد، کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اصولاً عقل کے مطابق بھی غیر معمولی کام کے بارے میں ۔۔ جز عدم امکان ۔۔ کوئی دلیل نہیں ہے۔اور ممکن ہے جن عوامل واسباب کو ہم جانتے ہیں ان کے ماوراء بھی کچھ دوسرے اسباب وعلل موجود ہوں جو کسی خارق عادت حادثہ کو وجود میں لائیں اور ہم ان اسباب کے بارے میں بے خبر ہوں۔

بعض معترضین نے کہا ہے: آیہ شریفہ میں اشارہ کئے گئے چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا مسئلہ در حقیقت ان حوادث کے بارے میں اشارہ ہے جو قیامت کے دن طبیعی عالم کے تباہ ہونے کے وقت رونما ہوں گے، نہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے بارے میں۔ لیکن اس احتمال کو بعد والی آیت مسترد کرتی ہے، کیونکہ خدائے متعال مذکورہ آیت کے بعد فرماتا ہے:

)وان یروا آیۃ یعرضوا ویقولوا سحر مستمر)(قمر،۲(

"اور یہ کوئی بھی نشان دیکھتے ہیں تو منہ پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ مسلسل جادو ہے"

واضح ہے کہ اگر آیہ شریفہ سے مراد وہی قیامت کے دن کی بربادی ہوتی تو مشرکین کے اعتراض اور اس معجزہ کو سحر کی طرف نسبت دینا معنی نہیں رکھتا۔

بعض دوسرے معترضین نے کہا ہے:اس آیت کا میں کرۂ چاند کا کرۂ آفتاب سے جدا ہونے کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ آج سائنس اس کی تائید کرتا ہے ۔حقیقت میں یہ قرآن مجید کی کرامتوں میں سے ایک ہے کہ اس واقعہ کے پیدا ہونے کے بارے میں صدیوں قبل خبر دیتا ہے، لیکن لغت شناسی کے مطابق یہ نظریہ غلط اور خطا ہے، کیونکہ کسی جسم کا کسی دوسرے جسم سے جدا ہونا تولد یا مطلق "انفصال" کو لغت میں " اشتقاق"و"انفصال" کہتے ہیں نہ " انشقاق" جس کا معنی دو ٹکڑے یا دو حصے ہونا ہے۔

بعض معترضین نے کہا ہے: اگر ایسا حادثہ رونما ہوا ہوتا تو غیر اسلامی مورخین نے اسے ضبط کر کے لکھا ہوتا۔ لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ روایتی تاریخ ہمیشہ وقت کے حکّام کی مرضی اور ان کے نفع میں لکھی گئی ہے اور ہر وہ قصہ اور حادثہ، جو وقت کے حکّام کے خلاف ہوتا اسے احتمال اور فراموشی کے پردہ میں رکھا گیا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں قدیمی تواریخ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام وحضرت موسیٰ علیہ السلام

اور حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ملتا، جبکہ دینی نقطہ نظر سے ان حضرات علیہم السلام سے رونماہوئے معجزات ناقابل انکار ہیں۔ یہ حضرت ابراھیم علیہ السلام ہی تھے جو نمرود کی آگ میں نہ جلے، حضرت موسی علیہ السلام تھے جنہوں نے عصا، ید بیضااور وہ سب معجزے دکھائے، یہ حضرت عیسی علیہ السلام تھے جو مردوں کو زندہ کرتے تھےاور جب اسلام کی دعوت پیدا ہوئی، وہ بھی دنیا کی تمام طاقتوں کی مخالف تھی۔

اس کے علاوہ اس معجزہ کے رونماہونے کی جگہ یعنی مکہ اور جہاں تاریخ لکھی جاتی تھی یعنی یورپ کے درمیان طلوع وغروب میں گھنٹوں کا تفاوت ہے۔ جو یہ آسمانی حادثہ کم وقت میں مکہ میں رونماہوااور مرئی تھا، دور دراز مغربی ممالک کے افق، جیسے، روم آتن وغیرہ میں قابل رویت نہیں ہوگا، چنانچہ ان علاقوں کے آسمانی حوادث مکہ کے علاقہ کے لئے قابل رویت نہیں ہیں۔

ایک بے بنیاد بات

سوال: کیاستارۂ زہرہ اتر کر حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام کے گھر کی چھت پر بیٹھنے کی کوئی دلیل وسند ہے؟

جواب: ستارہ زہرہ کے اترنے اور حضرت علی علیہ السلام کے گھر کی چھت پر بیٹھنے کے سلسلہ میں چند روایتیں نقل ہوئی ہیں، یہ روایتیں نہ متواتر ہیں اور نہ قطعی الصدور اس لئے علمی لحاظ سے قابل اعتماد نہیں ہیں۔

چور کا ہاتھ کاٹنے کا فلسفہ

سوال: چور کا ہاتھ کیوں کاٹا جانا چاہئے؟

جواب: چور کا ہاتھ کاٹنے کا مسئلہ، جو اسلامی شریعت میں حدود کا جز ہے، حقیقت کے پیش نظر دو بنیادی مسئلوں کے مطابق قابل تجزیہ ہے:

۱۔ یہ کہ چور نے جو ایک نامناسب کام انجام دیا ہے اسے اس کی سزا ملنی چاہئے۔

۲۔ یہ کہ یہ سزا اس کا ہاتھ کاٹنے سے انجام پانی چاہئے۔

پہلا اور چور کی سزا کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی تشریع کے سلسلہ میں دین اسلام تنہا نہیں ہے بلکہ انسان کی زندگی میں۔۔ جہاں تک ہمیں اطلاع ہے ۔ گوناگوں انسانی معاشروں میں (ابتدائی انسانوں کے خاندانوں اور قبائلی وطوائفی حکومتوں سے لے کر ڈکٹیٹر شپ اور جمہوری حکومتوں تک) چور کے لئے کچھ سزاؤں کے قائل تھے اور ان پر عمل بھی کرتے تھے اور آج بھی ایسا ہی کیا جارہا ہے۔

یہ امر مسلم ہے کہ عالم بشریت میں یہ فیصلہ اس بنیاد پر لیا جاتا ہے کہ حقیقت پسندانہ نگاہ سے اہم ترین اور قیمتی ترین چیز جسے انسان درک کرتا ہے بیشک اس کی زندگی ہے اس سے واجب اور لازم تر فریضہ کو درک نہیں کرتا ہے تاکہ اسی زندگی کی سعادت کا تحفظ کرے، یعنی اجتماعی ماحول میں اور اجتماعی طور پر تلاش وکوشش کر کے اپنی زندگی کے وسائل یعنی مال وثروت کو فراہم کر کے ان سے استفادہ کرے اور حقیقت میں (معاشرہ شناسی کی دقیق نظر میں) اپنی زندگی کی آدھی موجودیت۔ جس کے لئے محدود قدر وقیمت کا قائل نہیں ہو سکتا ہے۔ کو دوسرے حصہ کے لئے سرمایہ حاصل کرنے کے لئے صرف کرتا ہے۔ اور یہ بھی مسلم ہے کہ ہر چیز کا تحفظ اور اس کی رکھوالی اہمیت کے لحاظ سے خود اس چیز کی قدر وقیمت کے مساوی ہوتی ہے۔ اور جس مال کے فنا ہونے کے بارے میں کسی قسم کی اہمیت نہ ہو تو اس کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہوتی ہے، اور یہاں پر فیصلہ کرنا چاہئے کہ انسان کے مال کا محفوظ رہنا کلی طور پر اس کی آدھی عمر کی قدر رکھتا ہے۔ کیونکہ انسان کی جان کی قیمت اس کی پوری عمر کی قیمت کے برابر ہے۔ اسی طرح معاشرہ کے سرمایہ کے ارد گرد کھینچی گئی دیوار کو توڑنا اور نابود کرنا اس معاشرہ کی نصف زندگی کو نابود کرنے کے برابر ہے، چنانچہ ایک معاشرہ کی جانی امنیت کو ختم کرنا اس معاشرے کے تمام افراد کو

نابود کرنے کے برابر ہے:

...)من قتل نفساًبغیر نفس اوفساد في الارض فکأنما قتل النّاس جمیعا...۔) (مائدہ(

''جو شخص کسی نفس کو، کسی نفس کے بدلے یا روئے زمین میں فساد کی سزا کے علاوہ قتل کر ڈالے گا، اس نے گویا سارے انسانوں کو قتل کر دیا''

البتہ اس صورت میں جو چور انسانی معاشرہ کی مالی امنیت کو سلب کرتا ہے اسے سخت سزا کا سامنا کرنا چاہئے تاکہ اس کے نفاذ کا تصور اسے معاشرہ کی مالی ناموس کا پردی چاک کرنے میں رکاوٹ بنے۔

لیکن دوسرا مسئلہ، چور کا ہاتھ کاٹنا، جس کا دین مقدس اسلام کے قانون نے حکم دیا ہے، اس کے قصاص کے بارے میں تشریع کئے گئے احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ، سزاؤں کے بارے میں، مجرم کے مظلوم پر وارد کئے گئے صدمہ کو اسی صورت میں مجرم پر وارد کیا جاتا ہے تاکہ اسے اس کے عمل کے مطابق کیفر کردار تک پہنچایا جائے یا دوسروں کے لئے عبرت کا سبب بنے۔ البتہ جس جرم کا نتیجہ حقیقت میں دوسروں کی نصف زندگی کو نابود کرنے میں تمام ہو جائے، اس کی کم و بیش کسی رقم کے جرمانہ یا چند دن اور چند ماہ جیل بھیجے جانے سے تلافی نہیں ہوسکتی ہے۔ اس مطلب کا بہترین گواہ یہ ہے کہ اس قسم کی سزائیں نافذ کرنے کا۔ جو مدتوں سے اکثر ممالک میں رائج ہیں۔ ان جرائم کو روکنے کے سلسلہ میں کوئی نسخہ نہیں نکلا ہے۔

اسلام میں اسی حقیقی محاسبہ کے مطابق، چور کا ایک ہاتھ کاٹا جاتا ہے، جو تقریباً اس کی زندگی کی تلاش کا نصف کے برابر ہوتا ہے۔ اس بیان سے ہمارے بعض روشنفکروں کے اس سلسلہ میں کئے جانے والے اعتراضات کا بے بنیاد ہونا واضح ہو گا (افسوس ہے کہ جس طرح ہمارے معاشرہ میں چوری نے ایک مسری والی بیماری کی طرح مالی امنیت کو مکمل طور پر نابود کر کے رکھ دیا ہے، اسی طرح اس بلا نے ہماری فکری ماحول میں بھی جڑ پکڑ لیا ہے اور صحیح اور سالم فکریں بھی آلودہ ہو رہی ہیں۔

یہ حضرات کہتے ہیں: ''ایک انسان کو اپنے خداداد ہاتھ سے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اپنے حالات کی بہبودی کے لئے کوشش کرنی چاہئے تاکہ اپنی زندگی کی مشکلات کو اپنے توانا ہاتھوں سے حل کرے، اقتصادی دباؤ کے نتیجہ میں انجام دئے گئے ایک اشتباہ کے نتیجہ میں اس کا ہاتھ کاٹ کر کیوں اسے عمر بھر کے لئے بیچارہ کر دیا جائے؟''

اس اعتراض کی حقیقت اصل جرم کو قبول کرنا اور رحم کی حس کے پیدا ہونے اور انسان دوستی کی بنا پر چارہ جوئی کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، صحیح ہے کہ ایک چور اپنے برے کام کی وجہ سے ایک جرم کا مرتکب ہوتا ہے، لیکن اس کے پیش نظر کہ غالباً اقتصادی دباؤ، ایک شریف انسان کو یہ جرم انجام دینے پر مجبور کرتا ہے، ترحمّ اور انسان دوستی اس میں روکاوٹ بنتی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ کر اسے ہمیشہ کے لئے بیچارہ بنا دیا جائے۔

اس منطق کا غلط ہونا صاف ظاہر ہے، کیونکہ انفرادی حقوق کے حکم میں جذبات کی رعایت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسلام بھی (جیسا کہ قرآن مجید کی آیات سے واضح ہے) انفرادی حقوق جیسے قصاص کے اقسام میں اور مالی حقوق میں صاحبان حقوق سے تحریک اور ترغیب سے درخواست کرتا ہے کہ اپنے حقوق سے چشم پوشی کریں اور اپنے ہم نوع بھائیوں کو مشکل اور تکلیف میں نہ ڈالیں۔

لیکن اجتماعی حقوق کے سلسلہ میں ایک مجرم کے بارے میں انسان دوستی کے جذبات سے کام لینا اور اس کے جرم کی سزا سے چشم پوشی کرنا حقیقت میں ایک

معاشرہ کے ساتھ بالکل بے رحمی سے ظلم کرنے کے مترادف ہے اور ایک چور کو آزاد چھوڑنا اور ایک مجرم کی آبرو کا تحفظ کرنا لاکھوں بے گناہوں پر

مصیبت ڈھانے اوران کے احترام کے پردہ کو چاک کرنے کے برابر ہے۔

ترحمّ برپلنگ تیز دندان ستمکاری بود بر گوسفندان

''تیز دانتوں والے خونخوار چیتے پر رحم کرنا بھیڑوں پر ظلم کرنا ہے۔''

بہر حال، مسئلہ یہ ہے کہ ایک مجرم کی سزا کے لئے وضع ہونے والے حکم اور قانون کی دفعہ میں مجرم کے معاشرہ کی حالت کو مد نظر رکھنا چاہئے اور معاشرہ کے پیکر پر لگے زخم کی مرہم پٹی باندھنی چاہئے نہ یہ کہ صرف انفرادی تربیت کا مسئلہ جیسے چور یا صاحب مال کو مد نظر رکھا جائے۔

یہاں پر ایک دوسرے اعتراض کا جواب بھی واضح ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ: دال روٹی کے لئے محتاج شخص جیسے فرد کو، فقر و بدبختی ایک لوٹا چرانے پر مجبور کرتی ہے، کا اس چور سے واضح فرق ہے جو چوری اور جرم کو اپنا پیشہ بنا کر ایک معاشرہ کو مصیبت میں ڈال کر ہر روز ایک بے گناہ خاندان کو بدبختی اور مصیبت سے دوچار کرتا ہے۔ البتہ ان دو مواقع میں واضح اختلاف پایا جاتا ہے، جبکہ اسلام نے دونوں مواقع کو ایک دوسرے کے معادل قرار دیا ہے اور ان کے درمیان سزا کی کیفیت میں کسی قسم کی

فرق کا قائل نہیں ہوا ہے!

اس اعتراض کا جواب گزشتہ بحث اور اس کے ساتھ ایک مختصر مقدمہ کی یاد دہانی سے واضح ہو جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں جرم اور خلاف ورزی کے طور پر پہچانے گئے کام اور ان کے بارے میں سزا اور حد واجب کی گئی ہے، جرم اور خلاف ورزی کو انجام دینے کے صرف آخری مرتبہ پر، حد جاری کی جاتی ہے، مثلاً زنا کرنے والے پر ''حد'' کے عنوان سے سو کوڑے لگائے جاتے ہیں اور اگر اس نے اس عمل کو کئی مرتبہ انجام دیا ہو اور اس پر کوئی حد جاری نہ ہوئی ہو اور اس کے بعد ثابت ہو جائے تو ایک حد (سو کوڑے) سے زیادہ جاری نہیں کی جاتی ہے۔

اس مقدمہ کے تذکر اور گزشتہ بیان کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ چوری کی حد آخری چوری کے مقابلہ میں ہے جو اسلامی عدالت میں ثابت ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں چھوٹی اور بڑی چوری کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور چوری کو وجود میں لانے کے عوامل اور شرائط سے کوئی ربط نہیں ہے اور ایک کہنہ مشق چور اور ایک مرغی چور یا لوٹا چرانے والے کے عمل میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے کہ انہوں نے معاشرہ کے ارکان میں سے ایک رکن کو صدمہ پہنچایا ہے۔ معترضین کہتے ہیں: ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے کی وجہ سے معاشرہ کے لئے باعث زحمت بنانا ملک کی پیداوار بڑھانے والے ایک عامل کو نقصان پہنچانا کس اصول اور منطق کے مطابق صحیح ہے۔؟

ان حضرات سے کہنا چاہئے کہ چور کا ہاتھ کاٹنا انگوٹھے کے بغیر اس کی چار انگلیاں کاٹنا ہے۔ جس ملک اور معاشرہ میں عام طور پر پورے اعضاء اور ناقص اعضاء والے گوناگون افراد موجود ہوں اور ہزاروں قسم کی احتیاجات پیدا ہوتی ہوں، ایک ایسے فرد کے لئے کام کرنا مشکل نہیں ہوگا جس کے ایک ہاتھ کی صرف چار انگلیاں نہ ہوں اور وہ معاشرہ کے لئے ایسا بوجھ نہیں بن سکتا ہے کہ ملک کی پیداوار پر اثر ڈالنے اور اسے معطل اور سست کرنے کا سبب بن جائے ،اسی لئے دوسری بار چوری کی حد دوسرا ہاتھ کاٹنا نہیں ہے بلکہ پہلی مرتبہ ہاتھ کاٹنے کے بعد اگر پھر سے چوری کا مرتکب ہو جائے تو چور کا بایاں پاؤں کاٹا جانا چاہئے۔

اگر ہم فرض کریں کہ ایک یا چند افراد کے ہاتھ کاٹے جانے سے واقعاً معاشرہ کی مشکلات کے بوجھ کو بڑھا وامل کر ملک کے اقتصاد کے پہیئے کو سست کرنے کا سبب بنتا ہے، تو کیا اس غیر محسوس اور ناقابل اہمیت بوجھ کا اضافہ ملک کی اقتصادی سلامتی کی حفاظت کی نسبت آسان تر نہیں ہے کہ اقتصادی سلامتی کی

بنیاد کونابود کرکے ایک زندہ معاشرہ کونیم جان بنادے؟!

کتنی مضحکہ خیز منطق ہے کہ اگر سزاکے طور پر چور کاہاتھ کاٹاجائے تووہ معاشرہ کے لئے بوجھ بن سکتاہے لیکن اس کے ساتھ نہ چھیڑاجائے اوراسے اپنے پیشہ کو جاری رکھنے کے لئے آزاد چھوڑدیاجائے یااسے زندان میں ڈال کراس کی زندگی کی ضروریات کوپوراکیاجائے،تووہ معاشرہ کے لئے بوجھ نہیں ہوگا!

کیاتین کروڑآبادی والے ہمارے ملک میں موجودہ حالات کے پیش نظرچوراور جیب کترے معاشرہ پر بوجھ نہیں ہیں؟باوجوداس کے کہ اتفاقاًاہم اور غیر اہم چوری کااقدام کرنے والے افراد کی تعداداندازہ سے باہرہے،اس برے کام کوپیشہ کے طور پرانجام دینے والے چوروں اور جیب کتروں کی تعداد کئی ہزار سے گزرچکی ہے۔

ان میں سے جوآزادہیں اور بے باکی سے اپنے شغل کوانجام دیتے ہیں،ان کی روزمرہ زندگی کی ضروریات دوسروں کی کوششوں اور محنتوں کے نتیجہ سے ادارہ اور پوری ہوتی ہیں۔اس کے علاوہ چوری کے نتیجہ میں رونماہونے والے روزمرہ قتل اور جانی نقصانات کے حوادث کی خبروں کوہم روزناموں میں پڑھتے ہیں۔

ان میں سے جوافراد حکومت کے دام میں پھنس جاتے ہیں،اس کے علاوہ کہ ان

مجرموں کے لئے لوگوں کی محنتوں سے حاصل کی گئی بڑی رقومات خرچ ہوتی ہیں،اور یہ لوگ حبس کے دوران بڑے آرام سے ملت کی محنتوں کے نتیجہ میں حاصل کی گئی نعمتوں سے استفادہ کرتے ہیں،ضمناًجیل کاٹنے کی مدت کے دوران مختلف قسم کے چوروں سے آشناہوکرچوری کی ٹریننگ بھی حاصل کرتے ہیں!

معترضین کہتے ہیں:اگریہ سزادوسروں کی عبرت کے لئے ہے توامریکہ میں ماہر نفسیات کے دانشوروں نے،مجرمانہ فلمیں بناکرسنیماؤں میں ان کی نمائش کی،شایداس طرح لوگ عبرت حاصل کریں،لیکن نہ یہ کہ لوگوں نے اس سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی بلکہ جرم کی ٹریننگ بھی حاصل کرکے اسی رات کواسی شہر میں اس فلم کے مشابہ جرائم کے مرتکب ہوئے اور آج تک کھلے میدانوں میں اتنے مجرموں کوپھانسی پر لٹکانے سے کوئی عبرت حاصل نہیں ہوئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سنیماؤں میں مجرمانہ اور عاشقانہ فلموں کی نمائش اوراسی طرح نشریات ومطبوعات میں مجرمانہ اور عاشقانہ داستانیں شائع ہونا،جرائم اور فساد کے تبلیغاتی عوامل ہیں اور یہ چیزیں فضایاکوایسے آراستہ کرتی ہیں کہ انسان ہمیشہ حق سے بے خبر رہ کراپنی زندگی کی سعادت وخوش قسمتی کوعشق بازی اور بے راہ روی میں پاتاہے۔

لیکن ایسی حالت میں بھی ایک مفکر کاذہن اور ایک باضمیر انسان کاضمیر ہرگزیہ قبول نہیں کرتاہے کہ صحیح طور پرانجام پانے والی تعلیم وتربیت کاکوئی اثر نہیں ہوگایاعام سزاؤں کانتیجہ عبرت بن کرکچھ لوگوں کوراہ راست قبول کرنے پر مجبور نہ کرے۔

البتہ اجتماعی اسباب وعوامل بھی طبیعی اسباب وعوامل کے مانند ہمیشہ اپنے نتیجہ واثر کواکثر صورت میں ظاہر کرتے ہیں نہ دائمی صورت میں،اور جوایک موثر قانونی سزامیں مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ جرائم کوکم کرکے استثناء کی حد تک لایاجائے نہ یہ کہ ان کی ایسی بیخ کنی کرے کہ ہرگزواقع نہ ہوں۔

دسواں حصہ:

قرآنی علوم

قرآنی علوم

حروف مقطعات کس لئے ہیں؟

سوال: خدمت استاد و دانشور محترم حجۃ الاسلام علامہ سید محمد حسین طباطبائی!

قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے، جسے خدائے متعال نے مختلف زمانوں اور معین اوقات میں اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تدریجاً وحی فرمائی ہے۔ابن سیرین کے عقیدہ کے مطابق اس کی کل آیات کی تعداد "۶۲۱۶" اور ابن مسعود کے مطابق "۶۲۱۸" آیات ہے۔اور اس پر ہر ایک کا اتفاق نظر ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی کل تعداد ۱۱۴ ہے۔قرآن مجید کی ۲۸ سورتیں حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہیں۔مانند: الم، الر، المص، حم، طس طسم، کھیعص، یس، ص، ق اور ن وغیرہ۔

اب سوال یہ ہے کہ ان حروف کا معنی کیا ہے؟ اور تین مدنی سورتیں اور ۲۵ مکی سورتیں کیوں ان حروف سے شروع ہوئی ہیں؟ اور قرآن مجید کی تمام سورتیں ان حروف سے کیوں شروع نہیں ہوئی ہیں؟

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب جو قرآن مجید کو سن کر اسے حفظ

ا۔اس بحث کو حضرت آیت اللہ طباطبائی نے حلب کے استاد محترم عبدالرحمن الکیالی کے قرآن مجید کے حروف مقطعات کے بارے میں کئے گئے ایک سوال کے جواب میں بیان فرمایا ہے۔

کرتے تھے، جو اسے سن کر لکھتے تھے اور جو سن کر اس کے اوراق کی حفاظت کرتے تھے، کیا وہ ان حروف کے معنی کو سمجھتے تھے، جبکہ قرآن مجید عربوں کی زبان یعنی عربی میں نازل ہوا ہے۔؟

اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابتدائی اصحاب ان حروف کے معنی کو سمجھتے تھے تو کیوں ان کی تفسیر میں انہوں نے اختلاف کرکے کسی قابل قبول مطلب پر اتفاق نہیں کیا ہے؟! چنانچہ اس سلسلہ میں ان کے عقائد میں اختلاف تفسیر کی کتابوں میں درج ہے۔

بہر حال، ان حروف کا نازل ہونا فضول اور بے فائدہ نہیں تھا، ان کے ضرور کچھ معنی ہوں گے، پس ان کے حقیقی معنی کیا ہیں؟ کیا یہ رمزی حروف ہیں یا در اصل کلمات تھے جو خلاصہ ہوئے ہیں؟ یا کلام کے آغاز میں سننے والوں کی توجہ مبذول کرانے کے لئے ہیں یا خاص اصطلاحات ہیں؟

میں نے جس قدر روایتوں اور اصحاب کے اقوال پر سنجیدگی سے غور کیا آج تک میرے لئے اس موضوع کے بارے میں قرآن مجید کا مقصود واضح نہیں ہوا

ہے، مفسرین کے بیانات، مستشرقین کی تفسیروں اور عرفا کے اقوال نے بھی اس راز کو فاش کرنے میں کوئی مدد نہیں کی۔

لیکن چونکہ دانشوروں کے درمیان اس موضوع پر حیرت انگیز حد تک اختلافات پائے جاتے ہیں اس لئے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس سلسلہ میں آپ کے علمی عقیدہ کو معلوم کروں، شاید اس میں کوئی قابل قبول مطلب کو پاکر اپنے شک اور غلط فہمی کو دور کرسکوں۔

اس مشکل کو کشف کرکے اس معمّا کو حل کرنے کے سبب راہنمائی کی فضیلت حاصل کرنا اور حقائق کو پہچنوانا آپ کا حق ہے، نہ یہ کہ آپ یہ جواب دیں: "یہ حروف رموزات میں سے رمزی اسرار کے حروف ہیں اور خدا کے علاوہ کوئی ان کے معنی سے واقف نہیں ہے" کیونکہ ہم اس امر پر مکلّف ہیں کہ تمام آیات کے معنی کو سمجھ لیں اور خدا نے بھی اسے عربی زبان میں بشر کی ہدایت کے لئے نازل کیا ہے۔

آخر میں، اطمینان بخش جواب کا انتظار کرتے ہوئے اپنے بہترین درود و سلام آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور خدائے متعال سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کو محفوظ رکھے تاکہ آپ مسلمانوں کے لئے علم و شرف کے ذخیرہ ہوں۔ (حلب، ۲۸، صفر ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ ایلول ۱۹۵۹، ڈاکٹر عبدالرحمن الکیالی

جواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بخدمت استاد جناب ڈاکٹر عبدالرحمن الکیالی

آپ کی خدمت میں درود و سلام پیش کرنے کے ساتھ جواب میں تاخیر کے لئے معذرت چاہتا ہوں، کیونکہ جس وقت آپ کا خط قم پہنچا تھا، میں موسم گرما گزارنے کے لئے دماوند کے اطراف میں چلا گیا تھا۔ چونکہ قم اور دماوند کے درمیان کافی فاصلہ ہے، اس لئے دستی خطوط دمجھ تک پہنچے تھے، لہذا تاخیر سے آپ کے خط کی زیارت کرسکا۔

تفسیر میں ہماری روش اور طریقہ کار یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات اور ان کے معانی کو سمجھنے میں ہم قرآن مجید کے علاوہ کسی اور چیز سے استفادہ نہیں کرتے ہیں اور مشکل آیات کا صرف قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے استفادہ کرتے ہیں لیکن اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی متواتر خبر ہم تک پہنچی ہو تو وہ روایت اور صداقت کی نشانیاں رکھنے والی روایتیں بھی ہمارے لئے حجت ہیں اور تفسیر میں ان سے بھی استناد کرتے ہیں، کیونکہ خود قرآن مجید کی نص کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودا اور دستورات حجت اور واجب العمل ہیں۔

خاندان نبوت واہل بیت اطہار علیہم السلام کی احادیث بھی واجب الاطاعت اور حجت ہیں اور ہم ان سے بھی مدد لیتے ہیں۔ اس موضوع میں ہماری سند حدیث ثقلین ہے جو تواتر کی حد میں ہم تک پہنچی ہے اور اس کے علاوہ اور بھی احادیث موجود ہیں۔ اس مطلب کو ہم نے تفسیر المیزان کی پہلی جلد کے مقدمہ میں بیان کیا ہے اور تیسری جلد میں محکم اور متشابہ کی بحث پر مکمل طور پر روشنی ڈالی ہے۔

لیکن اصحاب یا تابعین یا مفسرین سے جو مطالب ہم تک پہنچے ہیں انھیں ہم حجت نہیں جانتے اور ان سے استناد نہیں کرتے ہیں (مگر یہ کہ کوئی قول ادلہّ کے موافق ہو) کیونکہ ان کے اقوال اجتہاد کے علاوہ کچھ نہیں ہیں اور وہ بھی خود ان کے لئے حجت ہونے کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے ہیں۔ ہماری نظر میں ان کا اجتہاد اور غیر یقینی روایتیں مساوی ہیں اور دونوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہم نے تفسیر میں، اس روش اور طریقہ کار کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام سے نقل ہوئی بہت سی روایتوں سے استفادہ کیا ہے، جیسے: (ان القرآن یُصدّق بعضہ بعضا ۱) "قرآن مجید کی بعض آیات بعض دوسری آیات کی تصدیق کرتی ہیں،" (ینطق بعضہ ببعض ۲) قرآن مجید کی بعض آیات جب دوسری آیت کے ساتھ قرار پاتی ہیں تو اس کے معنی کو

آشکار کرتی ہیں اور (یشھد بعضہ علی بعض ۳) آیتوں کا ایک حصہ دوسرے حصوں

۱۔ احتجاج، ۱، ۳۸۹، ۲ و ۳۔ بحار الانوار، ۸۸، ۲۲

کے لئے گواہ ہوتا ہے۔

یہ طریقہ کار، ایک صحیح شیوہ اور پسندیدہ طریقہ ہے جو روایتوں کی برکت سے ہمیں ملا ہے۔ بیشک قرآن مجید کی آیتیں کلام کا نظم اور اسلوب رکھتی ہیں اور دوسرے کلمات کے مانند قابل فہم ہونے کا ایک ظہور رکھتی ہیں، لیکن اس کے باوجود کہ ہم اپنی فہم میں آیات کے مقاصد اور معنی سے استفادہ کرتے ہیں، حروف مقطعات کو ہم نے کلام کے عام اسلوب کے موافق نہیں پایا اور ان کے بارے میں واضح معنی درک نہیں کر سکے اور الم، الر، طہ، یس جیسے حروف ہمارے لئے مجہول ہیں۔

یہاں پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حروف مقطعات دوسری آیتوں کے مانند نہیں ہیں کہ ان کے معنی کو سمجھانے کے لئے یہ عربی زبان کی عام روش میں نازل ہوئے ہوں۔

اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ان حروف کا وجود، لغو اور بے فائدہ ہے، کیونکہ خدا کا کلام لغو سے منزّہ اور پاک ہے، قرآن مجید اس کی توصیف میں فرماتا ہے :(انّہ لقول فصل * وماھو بالھزل) (طارق، ۱۳۔ ۱۴(

''بیشک یہ قول فیصل ہے۔ اور مزاق نہیں ہے''

اس بیان سے واضح ہوا کہ قرآن مجید کی بعض سورتوں کا حروف مقطعات سے شروع ہونے میں ضرور کوئی سبب ہے اور یہ حروف ایک خاص مقصد کے لئے ذکر ہوئے ہیں۔ لیکن اصحاب، تابعین اور مفسرین کی طرف سے جو اسباب ان کے بارے میں بیان کئے گئے ہیں، وہ حق و حقیقت کے ایک متلاشی کو مطمئن نہیں کرتے اور اسی لئے ہم نے اپنی تفسیر میں اس بحث کو سورۂ ''حم عسق'' تک تاخیر میں ڈال دیا، تاکہ خدائے متعال تب تک اس راز سے پردہ اٹھا کر ہمیں ایک اطمینان بخش صورت عطا کرے، البتہ اگر موت نے فرصت دی تو ہم یہ توفیق حاصل کریں گے۔

لیکن دوسری سورتوں میں مذکورہ سورہ کو ترجیح دینے کا سبب یہ ہے کہ اس سورہ میں خدا کی وحی اور اس کے الہام کی کیفیت بیان ہوئی ہے اور یہ ہماری بحث سے متناسب ہے۔

اب تک اس مشکل کو حل کرنے میں ہمیں اس قدر توفیق حاصل ہوئی ہے کہ اس قسم کی سورتوں میں بیان کئے گئے مضامین، معنی اور مقصد کے ساتھ ان حروف مقطعات کا ایک مخصوص رابطہ ہے؛ مثلاً ہم حروف ''الم'' سے شروع ہونے والی سورتوں میں ایک خاص رابطہ پاتے ہیں، اس کے باوجود کہ ان میں سے بعض مکی ہوں اور بعض مدنی ہوں۔ اسی طرح۔ ''الر'' یا'' حم'' و ''طس'' کے حروف سے آغاز ہونے والی سورتوں میں ایک ایسا رابطہ پایا جاتا ہے جو ان کے علاوہ کہیں موجود نہیں ہے۔ پھر ہم سورہ اعراف۔ جو ''المص'' سے شروع ہوئی ہے۔ میں وہی غرض اور معنوی مناسبت پاتے ہیں جو سورہ ''الم'' اور سورہ ''ص'' میں موجود ہے۔

اس سے ہم اجمالی طور پر سمجھتے ہیں کہ حروف مقطعات کا قرآن مجید کی سورتوں کے معانی اور مقاصد کے ساتھ ایک قسم کا رابطہ ہے، لیکن اس رابطہ کی کیفیت اور تفصیلات ابھی اچھی طرح سے واضح نہیں ہوئی ہیں، لیکن امید ہے کہ خدائے متعال اس حقیقت کو ہمارے لئے واضح فرما کر ہماری راہنمائی فرمائے گا۔

آخر میں اپنی طرف سے آپ کی خدمت میں بہترین درود و سلام بھیجتا ہوں اور خدائے متعال سے آپ کے لئے آرام و آسائش اور کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔

۲۱ ربیع الاول ۱۳۸۹ھ محمد حسین طباطبائی

قرآن مجید کی بے احترامی

سوال: قرآن مجید کے بعض۔ اغلب ایران میں منتشر ہونے والے۔ نسخوں میں ناشرین کی طرف سے (طلسم) کے نام پر کچھ (شکلیں) کلام اللہ کے ساتھ ضمیمہ کر کے چھاپ کر بیچی جاتی ہیں۔ کیا ان ''طلسمات'' اور شکلوں کے بارے میں کوئی صحیح سند موجود ہے یا نہیں؟

جواب: ان ''شکلوں'' اور ''طلسمات'' کے بارے میں کوئی صحیح سند نہیں ہے اور دینی نقطہ نظر سے ان کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، خواہ یہ قرآن مجید کے ساتھ شائع کی جائیں یا الگ سے۔

سوال: ان '' شکلوں'' اور ''طلسمات'' کے بارے میں عجیب و غریب چیزیں لکھتے ہیں اور ان سب چیزوں کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام سے نسبت دیتے ہیں، ان کے آثار اور فوائد کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: ان شکلوں میں نظر ڈالنے کے سلسلہ میں جن فوائد کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام سے نقل کیا گیا ہے ان کا ایک حصہ جعلی اور باطل ہے، جیسے ''مہر نبوت'' پر نظر ڈالنا وغیرہ... اور اس کا دوسرا حصہ فاقد سند ہے۔

سوال: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی تصویریں بنانا۔ جیسا کہ مشاہدہ کیا جارہا ہے۔ اور انھیں قرآن مجید کے ساتھ ضمیمہ کرنا اور اسی طرح مذکورہ شکلوں اور طلسمات اور ''محرم نامہ'' و''نوروز نامہ'' کو قرآن مجید کے ساتھ ضمیمہ کرنا شرعی لحاظ سے کیسا ہے؟

جواب: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی خیالی تصویر بنانا اور انھیں قرآن مجید کے ساتھ ضمیمہ کرنا اور اسی طرح توہمات پر مشتمل روایات کے ایک سلسلہ کو قرآن مجید کے ساتھ ضمیمہ کرنا، جیسے، اگر کوئی '' مہر نبوت'' نامی شکل پر نگاہ کرے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہزاروں حج کے ثواب اس کے نام پر لکھے جائیں گے! یا اگر فلاں شکل پر نگاہ ڈالی جائے تو اس کے تمام گناہ معاف کئے جائیں گے اور امت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شفاعت اس کے ہاتھ سونپی جائے گی! یہ سب چیزیں قطعاً قرآن مجید کی بے احترامی کا سبب اور حرام ہیں۔

اسی طرح شکلوں کے ایک سلسلہ جو طلسم وغیرہ کے نام پر قرآن مجید کے ساتھ ضمیمہ کرنا مذکورہ بیان کے مطابق کسی قسم کی سند نہیں رکھتے اور بے احترامی کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

بنیادی طور پر ایک مسلمان کو اس بدیہی نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہئے یا اس امر سے غفلت نہیں کرنی چاہئے کہ یہ مقدس آسمانی کتاب جسے کلام اللہ کہا جاتا ہے، اسلام کے اصلی اور فرعی معارف کی تنہا پناہ گاہ، نبوت کی زندہ سند اور دنیا کے ساٹھ اکروڑ مسلمانوں کی آبرو کا سبب ہے۔

اس نکتہ کے پیش نظر ایک مسلمان کا دینی ضمیر ہر گز اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ وہ کسی اور کتاب کو۔ ہر چند کہ وہ کتاب حقیقی مطالب پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو۔ قرآن مجید کے ساتھ ضمیمہ کر کے اسے اس کے برابر قرار دے کر معاشرہ میں شائع کرے، ''محرم ناموں''، ''نوروز ناموں'' اور ''کسوف وخسوف کے احکام'' جنھیں آج کل کی دنیا میں

۱۔ علامہ طباطبائی کا یہ بیان تقریباً ۴۷ سال قبل کا ہے۔ (مترجم(

مذاق کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان سب سے بدتر توہمات پر مشتمل شکلوں، نقشوں اور خیالی تصویروں کی بات ہی نہیں! ان چیزوں کو قرآن مجید کے

ساتھ ضمیمہ کرنا، کلام اللہ کی شان اور حقیقت سے کھیلنے کے مترادف ہے۔

جو ناشرین محترم اولیائے دین کی تاریخ، مذہبی عقائد، تجوید اور قرائت کی کتابوں کو قرآن مجید کے ساتھ شائع کرنا چاہتے ہیں، انھیں چاہئے کہ ان کتابوں کو الگ سے شائع اور جلد سازی کر کے قرآن مجید کے ہمراہ قارئین کی خدمت میں ارسال کریں۔

محمد حسین طباطبائی

قم۔ جمادی الثانی ۱۳۸۵ھ

گیارہواں حصّہ:

چنداعتراضات اوران کے جواب

چنداعتراضات اوران کے جواب

سلام علیکم ورحمۃاللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملااور کتاب ''شیعہ دراسلام''اور ''تفسیر المیزان'' کے مطالب کے بارے میں کئے گئےاعتراضات کا بھی مطالعہ کیا۔ان کتابوں کے مطالب کے بارے میں عمیق توجہ عنایت فرمانے پر بہت بہت شکریہ۔ جزاکم اللہ تعالٰی عن الحق والحقیقۃ خیر الجزاء۔

ذیل میں اعتراضات کا خلاصہ اوران کے جواب ملاحظہ فرمائیں:

اسلام میں شبہ کے معنی

پہلااعتراض: کتاب ''شیعہ دراسلام'' کے چوتھے صفحہ پر کہا گیاہے:''اسلام تسلیم کے معنی میں ہے'' یہ معنی لغوی طور پر صحیح ہے، لیکن اسلامی اصطلاح میں یہ کلمہ ایک ایسے دین کانام ہے جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے ہیں ''ماجاء محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم''،لیکن آپ کی تفسیر کے مطابق:

سب سے پہلے: ہم آیہ کریمہ:(ومن یبتغ غیر الاسلم دینافلن یقبل منہ...)ا سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت کوثابت نہیں کر سکتے۔

دوسرے یہ کہ: آپ کی تفسیر،اسلام کے معنی کی تفسیر میں بیان کی گئی اور اصطلاحی معنی کی تائید کرنے والی بہت ساری روایتوں کے منافی ہے، جیساکہ اصول کافی کی دوسری جلد میں آیاہے۔

ا۔اور جواسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کرے گاتووہ دین اس سے قبول نہیں کیاجائے گا...آل عمران،۸۵

تیسرے یہ کہ: دنیا کی مختلف امتوں کے اجماع کے مطابق لفظ ''اسلام''ایک ایسے دین کانام ہے جسے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کی طرف سے لاتے ہیں۔

جواب: کتاب ''شیعہ دراسلام'' کی عبارت یوں ہے:

''لغت میں''اسلام تسلیم کرنےاور گردن جھکانے کے معنی میں ہے۔قرآن مجید جس دین کی طرف دعوت کرتاہےاس کانام اس لئے اسلام رکھا گیاہے کہ اس کاکلی پروگرام انسان کاخالق کائنات کے سامنے تسلیم ہوناہےاور دنیاکے لوگ خدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اوراس کے فرمان کے علاوہ کسی کی اطاعت نہ کریں۔''

مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ اس عبارت سے کہاں یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اسلام کا ایک سے زیادہ معنی نہیں ہے اور وہ صرف لغوی معنی ہے، اور قرآن مجید اور حدیث میں جہاں بھی اسلام کا لفظ آیا ہے اسے صرف لغوی معنی میں لینا چاہئے ؟ اور کیا یہ عبارت وجہ تسمیّہ کے علاوہ کسی اور چیز پر مشتمل ہے ؟ اور جناب عالی نے خود بھی عبارت کے ضمن میں اعتراف فرمایا ہے : "اسلام، خدائے متعال کے سامنے تسلیم محض ہے، لیکن یہ تب تک محقق اور ظاہر نہیں ہو سکتا ہے جب تک نہ شہادتین اور کچھ ضروری اعمال کو انجام دیا جائے ۔" یعنی یہ دین اسم مصدر کے معنی میں تسلیم کا مصداق ہے ۔

بہر حال، لفظ "اسلام" اس مقدس دین کا نام ہے اور لغت کے مطابق تسلیم اور اطاعت کے معنی میں ہے اور کتاب و سنت کے بہت سارے مواقع پر ہر دو معنی میں استعمال ہوا ہے، اس آیہ کریمہ کے مانند :

)و من احسن دینا ممن اسلم وجھہ للہ وھو محسن واتبع ملتہ ابراھیم حنیفا...)١ ۔

جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ ملت ابراھیم، اسلام کے لغوی معنی کا مصداق ہے ۔ اسی طرح یعقوب کے فرزندوں اور اس امت کے مومنین سے یہ جملہ نقل کرتا ہے (...و نحن لہ مسلمون)٢ یہاں پر مسلمون کی تعبیر کی دلیل لغوی معنی مراد ہے ۔

لیکن جو آپ نے یہ فرمایا ہے کہ : "اگر اسلام اصطلاحی کے معنی میں نہ ہو تو ہم خاتمیت کو اس آیت : (ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ...)٣ سے ثابت نہیں کر سکتے ہیں" یہ اس وقت ممکن ہے جب خاتمیت کے لئے اس آیت کے علاوہ کوئی اور دلیل نہ ہو اور اس کا قبلی دشمن بھی مسلم ہو تو اسلام اس آیت میں اصطلاح کے معنی میں ہے اور دونوں مطلب ممنوع ہیں ۔

لیکن آپ نے جو یہ فرمایا: "روایتیں اصطلاحی معنی کی تائید کرتی ہیں" اصطلاحی معنی کے وجود کا کوئی منکر نہیں ہے، لیکن اصطلاحی معنی کا وجود لغوی معنی اور اس کا مقصود ہونے کی نفی نہیں کرتا ہے، اور روایتیں کبھی اصطلاحی معنی اور اس کے وصف کو بیان کرتی ہیں اور کبھی تسلیم کے معنی میں اسلام کے درجات اور مراتب بیان کرتی ہیں ۔

لیکن آپ نے جو یہ فرمایا ہے : "اسلام دنیا کی تمام مختلف امتوں کے اجماع کے مطابق، ایک ایسے دین کا نام ہے جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم لائے ہیں" اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ اسلام واقعاً اس دین مقدس کا نام ہے اور قرآن مجید کے

١۔ اور اس سے اچھا دین دار کون ہو سکتا ہے جو اپنا رخ خدا کی طرف رکھے اور نیک کردار بھی ہو اور ملت ابراھیم کا اتباع کرے... نساء، ١٢٥

٢۔ بقرہ، ١٣٣ و ١٣٦، ٣۔ آل عمران، ٨٥

بیان کے مطابق یہ نام گزاری پہلے حضرت ابراھیم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے ۔

)اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لربّ العٰلمین)١(...ھو سمّٰکم المسلمین من قبل..."٢ ۔

قرآن مجید اسلام سے آراستہ ہونے کو ابراھیم علیہ السلام اور اس کی امت کے بعد والے انبیاء سے نقل کرتا ہے، جیسے : اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، یوسف علیہ السلام، فرزندان یعقوب علیہ السلام، فرعون کے ساحر، ملکہ سباء اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری ۔

خدا کے دین کا نام "اسلام" رکھا جانا، اس کے پیش نظر کہ مصداق تسلیم تھا، پہلے توصیف کے عنوان سے تھا نہ علم نہو کی اصطلاح میں علم تھا، جیسے کہ

اسمائے حسنیٰ سب کے سب صفات ہیں، لیکن انھیں اسماءاللہ کہتے ہیں اور بعد میں استعمال کی کثرت کی وجہ سے غلبہ کے طور پر علم ہوئے ہیں پھر بھی اس میں ''الاسلام'' کے ''الف لام'' کے لغوی معنی کا اشارہ ختم نہیں ہوا ہے۔

''شیخیہ'' اور ''کریم خانیہ'' فرقے جسمانی معاد کے منکر ہیں:

دوسرا اعتراض:

''شیخیہ'' اور '' کریم خانیہ'' کے دو فرقے دوسرے شیعوں سے اختلاف رکھنے کی وجوہات کی بناپر، اس عنوان سے کہ ان کے اختلافات بعض نظریاتی مسائل کی توجیہ میں

۱۔''جب ان سے ان کے پروردگار نے کہا کہ اپنے کو میرے حوالے کردو تو انہوں نے کہا میں رب العالمین کے لئے سراپا تسلیم ہوں''بقرہ،۱۳۱

۲۔''...اس نے تمہارا نام پہلے بھی مسلم رکھا ہے...''حج،۷۸

ہیں نہ اصل مسائل کے اثبات و نفی میں، آپ نے ان کے اختلاف کو فرقہ قرار نہیں دیا ہے، جبکہ وہ معاد اور معراج جسمانی کے منکر ہیں اور حضرت حجت عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے بارے میں بھی کچھ باتیں کرتے ہیں...

جواب: کسی دین یا مذہب سے خارج ہونے کا معیار، اس دین یا مذہب کی بعض ضروریات سے انکار کرنا ہے، اس معنی میں کہ کوئی شخص کسی ایسے مسئلہ سے انکار کرے، جس کا اس دین یا مذہب میں ہونا ضروری اور بدیہی ہو اور ان مسائل میں بنیادی مسئلہ ہونا ضروری ہے اور اس کی خصوصیات نظری ہیں ۔جو شخص کتاب و سنت کے ظواہر سے ایک غیر جسمانی معاد کے وجود کو سمجھے، باوجود اس کے کہ مذکورہ ظواہر عادی افہام کے مطابق اس کے جسمانی ہونے کی دلالت کرتے ہیں، اس شخص کے لئے جسمانی معاد کا وجود ضروری نہیں ہے تاکہ اس کا انکار، ضروریات کا انکار ہو اور دوسروں کی نظر میں اس کا ضروری ہونا اس سے کوئی ربط نہیں رکھتا ہے اور اگر اس سلسلہ میں کسی اجماع کو بھی فرض کیا جائے، تو وہ اجماع غیر احکام فرعیہ میں ہوگا، اس لئے وہ اس کے لئے حجّت نہیں ہے۔

کیا عرفان اور تصّوف مورد تائید ہے؟

تیسرا اعتراض:

کتاب ''شیعہ در اسلام''میں جو آپ نے عرفان و تصوف کے بارے میں بیان فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عرفان و تصوف کو صحیح جانتے ہیں ، جہاں پر آپ اس گروہ کی پیدائش اور نشو و نما کی تاریخ اور ان کی اپنی روش کی حفاظت میں جد وجہد کا ذکر کرتے ہیں، جبکہ ائمہ اطہار علیہم السلام اور فقہا نے انھیں کافر ٹھہرایا ہے اور ان کے اقوال کو کسی صورت میں صحیح اور معتبر نہیں جانتے ہیں۔

اس کے علاوہ آپ اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں: ''عارف وہ ہے جو خدا کو محبت کی راہ سے پرستش کرے نہ ثواب کی امید یا عذاب کے ڈر سے''اس کے بعد فرماتے ہیں: ''خدا کی پرستش کرنے والے تمام ادیان میں کچھ ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو عرفان کا مسلک رکھتے ہیں حتی بت پرستی میں، بت پرستی، یہودیت، مسیحیت، مجوسیت اور اسلام میں بھی عارف اور غیر عارف ہیں'' ۔کیا اس بیان کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ بت پرستی میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کی محبت کی وجہ سے پرستش کرتے ہیں کیا یہ بات صحیح ہے؟

جواب: ہم نے کتاب ''شیعہ در اسلام''کی ابتدا میں عہد کیا تھا کہ مذہب شیعہ کا تعارف کرکے ان کی پیدائش اور نشو و نما کی تاریخ اور ان کے مختلف

گروہوں میں تقسیم ہونے اور ان کے افکار کو بیان کریں گے۔ یہاں پر ہم نے اپنے وعدہ کے مطابق کسی طرفداری کے بغیر عرفان کی پیدائش اور اس کے بقاء کی تاریخ کو خلاصہ کے طور پر بیان کیا ہے اور ان کے لئے کسی عظمت کو ثابت نہیں کیا ہے۔ ہم نے اجمالی طور پر ان کی عقلی اور نقلی دلیل (آپ کی فرمائش کے بر خلاف کوئی معقول و منقول دلیل ذکر نہیں کی ہے) کی طرف اشارہ کیا ہے۔

البتہ یہ کتاب ایک تعارفی کتاب تھی نہ فیصلہ دینے اور مذاہب کے حق و باطل کو تشخیص دینے والی کتاب، اس لئے مخالفین کے نظریہ پر بحث نہ کرتے ہوئے ہم نے فقہا کے حکم کفر کو نقل نہیں کیا ہے (البتہ ان کی تاریخ پیدائش میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے (

لیکن جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بت پرستوں میں بعض لوگ محبت کی راہ سے خدا کی پرستش کرتے ہیں، یہ برہمن اور ارباب ریاضت ہیں جو ''خداؤں'' کی عبادت کرتے ہیں نہ خدائے واحد کی، اور ان کے عقیدہ کے مطابق منفی ریاضتوں کے نتیجہ میں، وہ پہلے خود کو خداؤں میں اور پھر خدائے متعال میں فانی کر دیتے ہیں۔ چونکہ اس مسئلہ کی وضاحت بہت تفصیلی ہے ایک دو خطوط میں اس کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے بہتر ہے اس سلسلہ میں کتاب ''سر اکبر'' جو ''ویدا'' کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے، خاص کر ''اوپنشو''، کتاب ''فروغ خاور'' کتاب ''تحقیق ماللھند'' اور ابوریحان کی کتاب ''آثار الباقیہ'' کی طرف رجوع کیا جائے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ ھندی بت پرست بودھ اور صابئی کس قسم کا عرفان رکھتے ہیں۔

لیکن جو آپ نے فرمایا ہے: آپ کا کلام عرفان و تصوف کے صحیح ہونے اور ان کی توصیف کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ میں عرفانی کو صحیح جانتا ہوں لیکن نہ اس عرفان کو جو اہل سنت درویشوں کے سلسلہ میں رائج اور عام ہے اور شریعت کے مقابلہ میں ایک ایسے طریقت کے قائل ہیں جو ساز و سنطور، غنا رقص اور وجد کا حکم کرتا ہے اور ''تکلیف ساقط'' ہونے کا دم بھرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اپنے کلام کے ضمن میں کہا ہے کہ اسی روش نے شیعوں میں بھی سرایت کی ہے۔ جو عرفان کتاب و سنت سے حاصل ہوتا ہے، وہ عبودیت کے اخلاص پر مبنی ایک روش ہے اور اسلام کے شرع مقدس کے قوانین سے ذرّہ برابر جدا نہیں ہے۔ چنانچہ ہم نے اسے '' تفسیر المیزان'' میں بھی بیان کیا ہے۔

ملائکہ کے ارادہ کی کیفیت

چوتھا اعتراض: آپ نے تفسیر المیزان کی ساتویں جلد کے صفحہ نمبر ۹ پر لکھا ہے: دوسرے یہ کہ، یعنی خدائے متعال کے ملائکہ، جس چیز کا انھیں خدائے متعال امر فرماتا ہے وہ معصیت نہیں کرتے ہیں، پس وہ ایک مستقل ارادہ والا مستقل نفس نہیں رکھتے ہیں عدم معصیت اور عدم نفس مستقل کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے، چنانچہ انبیاء علیہم السلام اور معصومین علیہم السلام معصوم ہیں اور مستقل نفس اور ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ اگر مستقل ارادہ نہ رکھنے کی مراد یہ ہے کہ وہ ارادہ نہیں کرتے ہیں مگر جس چیز کا خدا ارادہ فرمائے (وماتشاؤن الاان یشاء اللہ) تو یہ معنی ملائکہ سے مخصوص نہیں ہے اور سب لوگ بلکہ خدائے متعال کے علاوہ تمام مخلوقات کی یہی حالت ہے۔

پھر اس کے بعد والے صفحہ پر کہا ہے: ''ملائکہ تدریجاً کمال حاصل کرتے ہیں اور اس طرح اپنے وجودی عنایتوں سے بہرہ مند ہوتے ہیں'' جب یہ نفوس ہی نہیں رکھتے تو کس چیز میں کمال حاصل کرتے ہیں؟

جواب: کلام کے ذیل میں مستقل نفس کی وضاحت کی گئی ہے کہ استقلال سے مراد ایک وہم ہے جسے شخص اپنے اندر مشاہدہ کرتا ہے اور اس استقلال کے منتفی ہونے سے ہوا و ہوس کی پیروی کلی طور پر منتفی ہوتی ہے:

)لایسبقونہ بالقول وھم بأمرہ یعملون) ۲ اور اس کا مرجع نفس امّارہ ہے اور اعتراض میں بیان کئے گئے مطلب کے بر عکس، ملائکہ کے مانند انبیاء وائمہ علیہم

السلام میں یہ نفس نہیں پایاجاتاہے۔

اوراس کے ذیل میں جواعتراض کیا گیاہے: ''جب ملائکہ نفس نہیں رکھتے ہیں توان کاتدریجاً کمال حاصل کرنا معنی نہیں رکھتاہے'' یہ ایک مغالطہ ہے اور اس جملہ کا مقصد

ا۔ نساء، ۳۰

۲۔ ''جو کسی بات پراس پر سبقت نہیں کرتے ہیں اوراس کے احکام پر برابر عمل کرتے رہتے ہیں۔'' انبیاء، ۲۷

کمال کی نفی ہے نہ کمال کااثبات اور جملہ ''من شانھا'' جملہ ''ھی فی معرض...'' پر عطف ہے اور ''من شانھا'' کا ضمیر مادۂ جسمانی کے بارے میں ہے نہ نفس کے بارے میں۔

حضرت الیاس علیہ السلام کے بارے میں ایک روایت

پانچواں اعتراض: ''تفسیر المیزان'' کی سترہویں جلد کے صفحہ نمبر ۱۶۷ پر الیاس علیہ السلام کے بارے میں جو روایت نقل کی گئی ہے، اسے آپ نے تضعیف کردیاہے۔

آپ نے کافی کی روایت کو، جسے علامہ مجلسی نے بھی ''حیات القلوب'' میں نقل کیاہے، نقل نہیں کیاہے۔اس کا مضمون حضرت الیاس کی وہ گفتگو ہے جو انہوں نے حضرت امام باقر علیہ السلام کے ساتھ انجام دی ہے۔ ممکن ہے مذکورہ روایت اعلیٰ درجہ پر صحیح نہ ہو لیکن ایک متین روایت ہے جو ظاہر قرآن مجید سے تضاد نہیں رکھتی ہے اور ضروری حقائق سے بھی ٹکراؤ نہیں رکھتی ہے۔ یہ روایت تفسیر میں آپ کی ذکر کی گئی دوسری روایتوں کے مانند ہے جو الیاس علیہ السلام کی حیات کو ثابت کرتی ہے۔

جواب: فی الحال میرے ذہن میں نہیں ہے کہ ہم نے کیوں مذکورہ روایت کو نقل نہیں کیاہے، شاید روایت کے طولانی ہونے کے سبب ہو یا غفلت ہوئی ہو اور اگر ہم نے اسے نقل بھی کیا ہوتا اس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلتا چنانچہ اس کی تفصیل بعد والے سوال کے جواب میں بیان ہوگی، اس کے علاوہ مثال کا احتمال بھی ہے۔

فرعون اور مجرمین

چھٹا اعتراض

آپ نے ''تفسیر المیزان'' کی سترھویں جلد کے صفحہ نمبر ۱۹۴ پر لکھاہے: ''بعض لوگوں نے کہاہے کہ فرعون کو ''ذوالاوتاد'' کہتے تھے اس لئے کہ وہ مجرموں کو میخوں سے زمین میں ٹھوک کر عذاب کرتا تھا''...

اس کے بعد آپ نے لکھاہے: ''ان باتوں کی کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں ہے ''جبکہ مرحوم فیض نے اپنی تفسیر ''صافی'' میں کتاب ''علل'' سے ''اوتاد'' کی تفسیر میں ایک حدیث نقل کی ہے۔

جواب: مذکورہ روایت مستدرکات میں سے ہے، کسی صورت میں تفسیر میں آنی چاہئے، لیکن قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اصول میں ثابت ہو چکا ہے کہ روایات آحاد اگرچہ بہتر صورت میں صحیح بھی ہوں احکام کے علاوہ، موضوعات، حجت نہیں ہیں مگر یہ کی قطعی قرینہ کے ہمراہ ہوں، مثلاًوہ حدیث جو بلاواسطہ خود امام علیہ السلام سے سنی جائے، اس لحاظ سے ایسی حدیثوں سے قرآن مجید کی تفسیر نہیں کی جاسکتی ہے۔اس کے علاوہ جبکہ قرآن مجید کے سلسلہ میں کثیر روایتیں موجود ہیں، اس قسم کی روایتوں سے قرآن مجید کی تفسیر کرنا بعید ہے۔

اس بناءپر، غیر قطعی الصدور روایتوں کا تفسیر میں نقل کرنا قرآن مجید کے سلسلہ میں صرف روایت بیان کرنا ہے نہ قرآن مجید کی تفسیر اور معنی حاصل کرنے کا مقصود ہے۔

قرآن مجید میں اصطلاح ''حسنہ'' کے معنی

ساتواں اعتراض: کہ یہ آیہ شریفہ: (...للذین احسنوا فی هذه الدنیا حسنة...)۱ ایک تعبیر کے ساتھ سورہ نحل اور سورہ زمر میں واقع ہوئی ہے جبکہ تفسیر میں ''حسنہ'' کو سورۂ نحل میں اخروی ''حسنہ'' اور سورہ زمر میں دنیوی اور اخروی دونوں کہا ہے اس کا سبب کیا ہے؟

جواب: لفظی اتحاد کے باوجود، آیہ شریفہ دو جگہوں پر سیاق میں اختلاف رکھتی ہے۔ سورہ نحل میں خدائے متعال کی طرف سے ایک خطاب ہے اور اس کے پیچھے اجر اخروی کی صفت ذکر ہوئی ہے اور سورہ زمر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے خطاب ہے اور اس کے پیچھے اجر صابرین کی صفت اور قرآن مجید کی زبانی صفت اخروی اور دنیوی دونوں پر اطلاق ہوئی ہے۔

ربّی کی تعبیر میں اختلاف کی وجہ

آٹھواں اعتراض: ''المیزان'' کی سترھویں جلد کے صفحہ نمبر ۲۲۰ پر آیہ شریفہ (واذکر عبدنا ایوب اذ نادی ربه...)۲ کے ذیل میں آپ نے لکھا ہے ''ایوب علیہ السلام کا خدا سے کلمہ ربّی'' سے پکارنا یہ بیان کرتا ہے کہ اس کی ایک حاجت تھی جبکہ آیت میں کلمہ ''ربہ'' ہے نہ ''ربیّ''۔

جواب: کلمہ (ربی) آیت کے مضمون سے اخذ کیا گیا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا قصّہ اور اختلافی روایتیں

نواں اعتراض: ''تفسیر المیزان'' کی سترھویں جلد کے صفحہ نمبر ۲۲۴ پر حضرت ایوب علیہ السلام کی داستان میں اسرائیلی روایتیں نقل کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ ترجمہ اور ہمارے بندہ ایوپ کو یاد کرو جب انھوں نے اپنے پروردگار کو پکارا۔۔۔

۱۔ نحل، ۳۰

۲۔ ص، ۴۱

آپ نے روایتوں کو نقل کرنے کے بعد دوسری روایتوں سے ان کو تضعیف کر دیا ہے، باوجود اس کے کہ وہ سب کتاب ایوب کے مطابق ''عہد عتیق'' میں ہیں اور روایتوں کے ٹکراؤ کی صورت میں ان کی عامہ کی موافقت توہین کا سبب ہے، یہودیوں کی موافقت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

جواب: چنانچہ ہم نے قبلاً بیان کیا کہ اس قسم کی احادیث کو نقل کرنے کا مقصد احترام ہے نہ تفسیر۔اور یہ جو آپ نے فرمایا ہے: ''جب دو متضاد خبروں میں سے ایک عامہ کے موافق ہو تو توہین ہے اس روایت کی بات ہی نہیں جو یہود کے موافق ہو'' یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ متضاد روایتوں میں حکم کا موضوع ،وہ روایتیں ہیں جو شرعی احکام میں بیان ہوئی ہیں نہ وہ روایتیں جو احکام سے خارج ہوں وہ اصلاً حجت نہیں رکھتی ہیں اور عامہ کی موافقت عامہ کے فتویٰ کے مطابق ہے روایت اور اسرائیلیات کے مطابق جو بھی ہوں احکام سے خارج ہیں اور وہ فتویٰ نہیں ہیں۔

قل ھو نباء عظیم کے بارے میں ایک بحث

دسواں اعتراض: آپ نے تفسیر ''المیزان'' کی سترھویں جلد کے صفحہ نمبر ۲۳۷ میں لکھا ہے: ''کہا گیا ہے:'' ''قل ھو نباء عظیم'' کی ضمیر قیامت سے مربوط ہے اور یہ بعید ترین معنی کا قول ہے جو کہا گیا ہے اس بعید کی دلیل کیا ہے؟ جبکہ صرف دو آیتوں کے فاصلہ پر اس سے پہلے پندرہ آیتیں قیامت کے دن اور لوگوں کے حساب کے بارے میں واقع ہوئی ہیں اور آپ نے خود سورہ ''نباء'' میں ''نباء عظیم'' کو قیامت کے دن سے تعبیر کیا ہے۔

جواب: ان ہی دو آیتوں: (قل انّما انا منذر...)۱ نے گزشتہ پندرہ آیتوں کو نئے سیاق میں تبدیل کیا ہے اور ان آیات کے ضمن میں فرماتا ہے: (قل ما اسئلکم علیہ من اجر وما انا من المتکلّفین *ان ھو الا ذکر للعٰلمین * ولتعلمنّ نباہ بعد حین)۲ سے مراد قرآن مجید ہے، البتہ کوئی حرج نہیں ہے کہ قرآن بھی قیامت کے مانند ''نباء عظیم'' ہو۔

والسلام علیکم

محمد حسین طباطبائی

۱۵؍۱؍۱۳۹۷

۱۔آپ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف ڈرانے والا ہوں (ص،۶۵(

۲۔اور پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ میں اپنی تبلیغ کا کوئی اجر نہں چاہتا اور نہ میں بناوٹ کرنے والا غلط بیان ہوں یہ قرآن تو عالمین کے لئے ایک نصیحت ہے اور کچھ دنوں کے بعد تم سب اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی''ص ۸۶۔۸۸

شہید شوشتری کے اعزاز میں منعقد کانفرنس

میں

علامہ طباطبائی کا پیغام

علامہ عالی قدر شہید قاضی نوراللہ شوشتر، ''احقاق الحق'' نامی معروف کتاب کے مصنف، کے اعزاز میں لکھنو (ھندستان) میں منعقدہ کانفرنس کے لئے علماءاور حوزۂ علمیہ قم کی عظیم شخصیتوں کی طرف سے مختلف پیغامات ارسال کئے گئے تھے۔

ذیل میں جناب استاد علامہ سید محمد حسین طباطبائی کا وہ پیغام ملاحظہ فرمائیں جسے اس کانفرنس میں علامہ موصوف کی طرف سے پڑھا گیا:

خدائے متعال، عزّ شانہ، اپنے کلام میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

) قل ما اسئلکم علیہ من اجر الاّ من شاء ان یتخذّ الی ربہ ّسبیلا) (فرقان،۵۷(

''اے رسول خدا! ''آپ کہہ دیجئے کہ میں تم لوگوں سے کوئی اجر نہیں چاہتا مگر یہ کہ جو چاہے وہ اپنے پروردگار کا راستہ اختیار کرلے۔''

اس معجزانہ کلام کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ۲۳ سالہ دعوت کا

اجراور پھل، دین مقدس اسلام ہے جو انسانی معاشرہ میں اپنے لئے جگہ پاکر مستقر ہوا ہے۔

اور مزید فرماتا ہے:

) قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودہ فی القربی...) (شوریٰ،۲۳(

...''اے رسول خدا! آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغ رسالت کا کوئی اجر نہیں چاہتا علاوہ اس کے کہ میرے اقربا سے محبت کرو''...

اس آیت کو گزشتہ آیت کے ساتھ ضمیمہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ جس دین کو خدائے متعال ہم سے چاہتا ہے اور اسے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا اجر قرار دیتا ہے، وہ ایسا دین ہے جو پیغمبرؐ کے اہل بیت کی محبت سے جڑا ہوا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث متواتر ''سفینہ'' میں فرماتے ہیں:

''مثل اھل بیتی کمثل سفینتہ نوح من رکبھا نجا و من تخلف عنھا غرق''۱۔

میرے اہل بیتؑ کی مثال نوح کی کشتی کے مانند ہے، جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جس نے اس سے مخالفت کی وہ ہلاک ہوا۔

اور اسی طرح حدیث متواتر ثقلین میں:

)انی تارک فیکم الثقلین، کتاب اللہ و عترتي اھل بیتی و انھما لن یفترقا حتی یردا علّی الحوض، ماان تمسکتم بھما لن تضلّوا ابعدي ابداً) ۲۔

۱۔ درالمنثور ۳،۳۳۴

۲۔ احقاق الحق: ۹،۳۴۱ (عبارت میں تھوڑی سی تغیر کے ساتھ(

''میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، کتاب خدا اور میری عترت، اہل بیت علیہم السلام۔ یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں۔ اگر تم انھیں اختیار کئے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔''

مذکورہ احادیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین اور اپنے اہل بیت علیہم السلام کے درمیان چولی دامن کے ساتھ کی وضاحت فرماتے ہیں اور ایک رسا بیان سے سمجھاتے ہیں کہ مسلمان کو چاہئے کہ اہل بیت پیغمبر کو اپنا پیشوا قرار دیں اور اپنے دین کو ان سے اخذ کریں۔اور یہ وہی شیعہ مذہب ہے جسے آج دنیا کی تقریباً دس کروڑ آبادی اپنا رسمی مذہب جانتی ہیں۔

جی ہاں! شیعہ مذہب وہی مقدس دین ہے جسے خدائے متعال نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ کا اجر قرار دیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا ماحصل شمار کیا ہے۔

شیعہ مذہب وہی گراں بہا دین ہے، جس کی بقاء کے لئے اہل بیت اطہار علیہم السلام کے بارہ پیشواؤں میں سے گیارہ نے اپنی جان کی قربانی دے کر اس کا تحفظ کیا ہے اور اس سے قبل جنگ احد میں پیغمبر اسلاؐم کی جبین مبارک اور دہان مبارک کا مقدس خون بھی اس کی بقاء کے لئے زمین پر گرا ہے۔

مذہب شیعہ وہی رنج ومصیبت دیدہ مذہب ہے، جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد گزشتہ چودہ صدیوں کے دوران، تاریخ کی گواہی کے مطابق، مختلف مراحل میں اس کے دسیوں ہزار بلکہ لاکھوں پیر وخاک وخون میں لت پت

ہوئے ہیں، جن میں غیر معمولی ذہنیت کی شخصیتیں اور دانشور بھی شامل تھے، جیسے شہید اوّل محمد بن مکی، شہید ثانی زین الدین احسائی اور شہید سعید قاضی نور اللہ شوشتری جو اس نورانی اور پر شکوہ آرام گاہ میں سوئے ہیں... ہمیں ان آثار کا مشاہدہ کر کے اپنے اسلاف کی ان مجاہدتوں اور قربانیوں کو یاد کرنا چاہئے ، جن کو انہوں نے خدا کی راہ میں اس مذہب کے احیاء اور بقاء کے لئے پیش کی ہیں، اور اس حق وحقیقت پر مبنی مذہب کے تحفظ، اس کی اشاعت اور پھیلاؤ کے لئے پہلے مرحلہ میں اہل بیت عصمت وطہارت علیہم السلام کے پیشواؤں نے اور دوسرے مرحلہ میں عظیم دانشوروں نے اس راہ میں جام شہادت نوش فرمایا ہے اور اس کے علاوہ لاکھوں بے گناہ پیر کاروں کے خون کی قیمت پر ہمارا یہ مذہب ہم تک پہنچا ہے۔ ہمیں اس راہ میں ہر قسم کی جانی اور مالی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرنا چاہئے:

)ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین(۱۔

محمد حسین طباطبائی

قم۔۱۰ رجب، ۱۳۹۰ھ

۱۔ خبردار! سستی نہ کرنا، مصائب پر محزون نہ ہونا اگر تم صاحب ایمان ہو تو سربلندی تمہارے ہی لئے ہے (آل عمران، ۱۳۹(

منابع اور مآخذ

۱۔قرآن مجید

الف:

۲۔الاحتجاج،احمد بن علی بن ابی طالب الطبرسی،موسسۃالاعلمی للمطبوعات،موسسہ اہل البیت علیہم السلام،بیروت۔

۳۔احقاق الحق،سید نوراللہ شوشتری،کتابفروشی اسلامیہ،تہران۔

ب:

۴۔بحارالانوار،علامہ مجلسی،موسستہ الوفاء،بیروت،طبع دوم

ت:

۵۔تفسیر ابوالفتوح رازی،شیخ ابوالفتوح رازی۔

۶۔التوحید،ابی جعفر محمد بن علی بن الحسین ابن بابویہ القمی،الصدوق،دفتر انتشارات اسلامی۔

د:

۷۔الدرّالمنثور،جلال الدین سیوطی،دارالمعرفۃللطباعۃوالنشر،بیروت۔

ر:

۸۔رسالۂ لقائیہ

۹۔روح المعانی،آلوسی بغدادی،داراحیاءالتراث العربی،بیروت

ل:

۱۰۔اللھوف فی قتلی الطفوف،علی بن موسی بن جعفر بن محمد طاؤس،المطبعتہ الحیدریہ،نجف۔

م:

۱۱۔مجمع البیان فی تفسیر القرآن،ابی علی الفضل بن الحسن الطبرسی،کتاب فروشی اسلامیہ۔

۱۲۔مصباح الشریعہ،الامام جعفر الصادق علیہ السلام،موسسہ الاعلمی،بیروت۔

۱۳۔معالی السبطین،محمد مهدی المازندرانی الحائری،تبریز۔